

نقوشِ حیات

سید مشتاق حسین بخاری



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقوشِ حیات

سید مشتاق حسین بخاری

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب	نقوشِ حیات
مصنف	سید مشتاق حسین بخاری
موضوع	زندگی کے مشاہدات وتاثرات
کمپوزنگ/ پروف ریڈنگ	احمد جمال
سرورق	محمد نواز
سال اشاعت	2022ء
قیمت	روپے
پبلشر	دی پرنٹ مین پرنٹرز اینڈ پبلشرز پشاور

انتساب

حیاتِ مستعار کے ان لمحات کے نام
جن کی یاد نے میرے اندر اس تالیف کی تخلیق کا ذوق پیدا کیا۔

ان تمام افراد، شخصیات اور اداروں کے نام
جنھوں نے میری زندگی کے مختلف ادوار پر اپنے اثرات نقش کیے۔

حسن ترتیب

پیش لفظ

میری زندگی میں کتاب اور قلم سے واسطہ بچپن سے ہے اور اس تعلق نے لکھنے لکھانے کے عمل کو ہمیشہ سے تحریک دیئے رکھی۔ بچپن میں ''بچوں کی دنیا'' میں قلمی دوستی اور تعارفی خطوط سے تحریروں کے آغاز سے ہوتا ہوا یہ سفر کالج اور یونیورسٹی کی میگزینوں میں مضامین لکھنے کے بعد 90 کی دہائی میں ایک ماہنامہ رسالے ''دی ایجوکیٹرز'' کے اجرا سے قلم کے سفر کی ایک منزل کا اختتام ہو کر کتب کی تصنیف و تالیف کی ایک نئی منزل کے سفر کا آغاز ہوتا ہے۔

ایک طرف جہاں طویل المدت پیشہ تدریس کی مصروفیات اس سفر میں حائل رہیں وہاں اسی پیشہ تدریس نے میری اس سوچ کو یہ مہمیز بھی دی کہ اگر میں دو چار حروف لکھ سکنے کی استطاعت رکھتا ہوں تو کیوں نہ ان نقوش کو اجاگر کروں جنہوں نے میری بچپن کی زندگی سے لے کر اب تک اس پر اپنے اثرات ڈالے۔ یہ واقعات و مشاہدات گو مدت سے میرے ذہن میں محفوظ تھے اور حصہ قرطاس بننے کے لئے بھی ایک عرصے سے مچلتے رہے مگر میری پیشہ ورانہ مصروفیات اور دیگر سرگرمیاں آڑے آتی رہیں۔

میرے مرحوم والدین جن کی یاد میری زندگی کے آخری سانس تک ساتھ رہے گی، کے ساتھ ''میرے بچپن کے دن'' شروع ہوتے ہیں، وہ خوشگوار لمحات میری یادوں کے ان ادوار کو گھیر لیتے ہیں جن میں بچپن کے غموں سے آزاد لمحات کا ذکر آتا ہے۔ اسی دورِ حیات میں میری ابتدائی تعلیم، اسی دور کے اساتذہ، طریقہ تعلیم اور ہم مکتب اور ہم جماعت ساتھیوں کی یادیں تازہ ہوتی ہیں۔

''نقوشِ حیات'' میں میری زندگی کے اہم واقعات کا ذکر عرف عام میں کوئی سوانح عمری نہیں ہے بلکہ یہ اس دور کی عمومی زندگی میں طرز رہائش، طرز تعلیم اور اس وقت کے لوگوں کی تہذیب و تمدن کا ذکر ہے جسے پڑھ کر آج کا قاری (طالب علم، استاد، ملازم پیشہ، کسان، زمیندار اور کوئی بھی پروفیشنل) موجودہ دور سے اس کا موازنہ کر سکتا ہے۔ آپ ان واقعات اور لمحات کو تاریخ کا حصہ بھی کہہ سکتے ہیں ہیں اور میری ذاتی زندگی کے حوالے سے ماضی کے تجربات، مشاہدات اور تاثرات بھی۔ ماضی کی زندگی اور خاص کر اپنی بہت ہی بچپن کی زندگی کی یادوں کو لاشعور سے شعور تک سمیٹ کر لانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ بچپن کے ساتھی، معصومیت کے دور

کے کھیل ہم جماعت ساتھیوں کا ذکر اور عملی زندگی کے چند اہم واقعات و تجربات کو ترتیب سے احاطہ تحریر میں لانے میں ایک مدت لگ گئی۔

تالیف ہذا کے بارے میں اس دعوے کا شائبہ تک بھی نہیں ہونا چاہیے کہ یہ نثر کا ادبی شاہپارہ یا کوئی شاہکار ہوسکتا ہے البتہ راقم کے اپنے تجربات و مشاہدات سے قاری کی دلچسپی اور افادیت کا کوئی پہلو نکل سکتا ہے تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت رائگاں نہیں گئی۔

کتاب کے اوراق میں اپنے مشاہدات اور تجربات کے بیانیے میں اگر کسی کو کہیں کوئی ناگواری محسوس ہو تو اس کو میری خطا اور کوتاہی سمجھ کر درگزر فرمائیے گا۔

حرف آخر کے طور پر عرض کرتا چلوں کہ یہ اوراق تو اس حیاتِ مستعار کے چند نقوش ہیں۔ جب تک سانس باقی ہے اس دنیاوی زندگی کے بحرِ ناپیدا کنار پر نت نئے نقوش ابھرتے رہیں گے۔ ان آئندہ کے نقوش کو سمیٹ کر کسی نئے مختلف ایڈیشن میں کسی بھی لمحے پیش کیے جاسکتے ہیں۔

بشرطِ زندگی ان شاء اللہ

اظہارِ تشکر

تالیف ہذا کی تکمیل پر میں ان تمام خواتین وحضرات کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں جنہوں نے کتاب کے مواد کی تکمیل میں میری یاداشتوں میں معاونت کی اور اوراق وصفحات اور مواد کی کمپوزنگ وترتیب میں لمحہ بہ لمحہ معاونت کی۔عزیزم زریاب مسعود،عزیزم واصف الاسلام شاہ اورعزیزم سبط حسنین شاہ کا مشکور ہوں جنہوں نے کتاب کے لیے چند نایاب تصاویر مہیا کیں۔

ان اہل علم و دانش خواتین وحضرات کا تہِ دِل سے مشکور ہوں جنہوں نے کتاب کے بارے میں اپنے زریں خیالات کا اظہار کر کے راقم کی حوصلہ افزائی کی۔خصوصاً ڈاکٹر فہمیدہ تبسم صاحبہ، محترم سجاد بلوچ صاحب، محترم ڈاکٹر محمد وسیم انجم صاحب اور اپنے عزیزاں ڈاکٹر سید اسد حسین شاہ اور ڈاکٹر سید چراغ حسین شاہ صاحب نے اپنے زریں کلمات سے کتاب ہذا کی قدر و قیمت میں اضافہ کیا۔

میرے رفیقِ کار محمد نصیر قریشی صاحب ،مواد کی کمپوزنگ کے لیے میرے شاگردِ عزیز احمد جمال جان اور واجد خان خلیل میرے خصوصی شکریے کے مستحق ہیں جنہوں نے تالیف ہذا کی ترتیب و تدوین کے طویل عرصے میں اس کے مواد کو سنبھالا،اس کی حفاظت کی،تمام تکنیکی امور میں مجھے مدد اور رہنمائی مہیا کی،مختصراً کتاب کی تیاری وطباعت واشاعت کے ہر مرحلے پر وہ میرے ہمقدم رہے۔

اور آخر میں کتاب کے پبلشرز ''دی پرنٹ مین پرنٹرز اینڈ پبلشرز'' اور خاص کر محمد نواز کا شکر گزار ہوں جنہوں نے دن رات ایک کر کے کتاب کی ترتیب وتدوین اور اشاعت کے تمام مراحل طے کر کے اسے پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔

دیباچہ

☆پروفیسر ڈاکٹر فہمیدہ تبسم

لوحِ دِل اور نقوشِ ماضی

ایک خوشۂ گندم کی خواہش میں جنت بدر ابن آدم اپنی سرشت میں مہاجر و مسافر ہے۔ دست قدرت نے اس آسمان زاد کو بہ طور آزمائش ''سیروافی الارض'' کا پروانہ جاری کرتے ہوئے اس کے اسباب سفر میں شب و روز کا خاکہ بھی رکھا جس میں نقش کاری خود اس کی صوابدید پر چھوڑ دی گئی اب یہ مسافر پہ منحصر ہے کہ وہ سرسری اس جہاں کی سیر کرتا ہے یا ہر جا کو جہان دیگر سمجھ کر دریافت کے عمل سے گزرتا ہے۔ برسوں کے ایورسٹ سے صرف نظر کرتا ہے یا لمحے کے نیوکلس کی جگر پاشی کرتا ہے۔ یہ خالصتاً اس کا اپنا مزاج اور انتخاب ہے۔

سرسری زندگی گزارنے والے بے شمار ایسے لوگ ہیں جو استاد ذوق کے اس شعر کی مثل ہیں۔

لائی حیات آئے، قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے، نہ اپنی خوشی چلے

ایسا نہیں کہ راہ حیات کے ان مسافروں کی گٹھڑی خالی اور دامن دریدہ ہو، دراصل آمد و رفت کے سادہ کلیے پر یقین رکھنے والے ان لوگوں کے پاس عطا کی نعمت نہیں ہوتی جو ان کی روداد ہوتی ہے اسے دوسروں تک پہنچانے کا سلیقہ نہیں ہوتا اپنی ذات سے جڑی وارداتیں بانٹنے کا قرینہ نہیں ہوتا حالانکہ تقسیم فقط وراثتی جائیداد ہی نہیں ہوتی ہماری یادوں کا سرمایہ بھی تقسیم کا متقاضی ہے انسان فقط اپنی نسل میں زندہ نہیں رہتا وہ ان لفظوں میں بھی زندہ رہتا ہے جو وہ آنے والے زمانوں کے سپرد کرتا ہے۔

سید مشتاق حسین شاہ صاحب ان ہی فیاض لوگوں میں سے ایک ہیں جنہیں تقسیم کا شرف عطا کیا گیا ہے۔ اپنی ہنر کاری سے انہوں نے لفظ کے مضبوط شجر میں یادوں کی پختہ پیوند کاری سے خود کو امر کر لیا ہے۔

''نقوش حیات'' ان کے سفرِ زیست کی یادداشتوں پر مشتمل آپ بیتی ہے مگر اس میں جگ بیتی کے عناصر بھی موجود ہیں۔ اس خوب صورت تصنیف کے مطالعے کے دوران مجھے بارہا محسوس ہوا کہ شاہ صاحب ایک میر کارواں کی طرح مجھ جیسے کتنے ہی مسافروں کو اپنے ہمراہ لے کے چلے ہیں۔ کالا چٹا پہاڑ کی رعنائیاں، نالہ نندنا کی پنہائیاں، قدرتی چشموں کا آب حیات، شام ڈھلے گھروں کو لوٹتے مویشیوں کے گلے میں بندھی گھنٹیوں کی صدا، ذات سے حیات تک کتنے ہی مناظر ہیں جو شاہ صاحب کے معجز نما قلم نے قرطاس پہ اتارے ہیں سچ تو یہ ہے

کہ بازگشت و بازدید کے اس سفر میں وہ تنہا نہیں ہیں بلکہ علاقہ نلہ سے وابستہ ان کی یاد کے قافلے میں کئی لوگ شریک سفر ہیں یوں لگتا ہے بقول محسن نقوی:

جہاں جہاں تیرا نقش ٹھہرا
میں ہو کے آیا وہاں وہاں سے

''نقوش حیات'' میں اگرچہ ایک اچھی آپ بیتی کے تمام خصائص موجود ہیں لیکن اس کا اسلوب بیان اس قدر رسادگی و پرکاری اور حلاوت کا مظہر ہے کہ قاری ھل من مزید کا تقاضا کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ شاہ صاحب ادب شناس ہستی ہیں اور حرف و بیان پہ مکمل دسترس کے حامل ہیں یہی وجہ ہے کہ ''نقوش حیات'' فقط یادداشتوں کا مجموعہ نہیں بن پائی بلکہ ایک ایسی داستان محسوس ہوتی ہے جس میں دلچسپی کا سحر پھونک دیا گیا ہو۔

اس کتاب کے وسیلے سے کئی ایسی شخصیات بھی تاریخ ادب میں زندہ ہوگئی ہیں جن کا ذکر اب شاذ ہی سنائی دیتا ہے اور آنے والے دنوں میں شاید یہ ذکر بھی شامل محفل نہ رہے میری مراد شاہ صاحب کے دور طالب علمی کے ان اساتذہ کرام سے ہے جو آج موجود نہیں لیکن اس کتاب کی وجہ سے فراموشی کی دھند سے باہر آ گئے ہیں۔ گکھڑ کی مسکراتی جھاڑی سے سانحہ آرمی پبلک سکول تک شاہ صاحب نے ہر یاد کو قیمتی نگینے کی طرح سنبھالا اور اپنے قارئین تک پہنچایا۔ یہ ان کا احسان ہے کہ انھوں نے خود سے وابستہ قیمتی یادوں کو تقسیم کیا۔ اللہ انھیں عمر خضر عطا فرمائے وہ لکھتے رہیں اور ہم پڑھتے رہیں۔

نقوش حیات جیسی کتابیں دل کی آنکھ سے پڑھی جاتی ہیں اور میں نے ایسا ہی کیا لیکن جو اس کتاب پر تبصرے کا حق ہے وہ میں ادا نہیں کر پائی۔ پرانے لوگ کہا کرتے تھے ''تھوڑا کہے کو بہت سمجھئے'' سو میری گزارش ہے کہ میرے تھوڑا لکھے کو بہت سمجھئے اس ''بہت'' میں وہ بے پناہ دلی احترام، عقیدت، نسبت اور محبت شامل ہے جس کے پردے میں پیر سید محمد علی شاہ صاحبؒ اور والد محترم حافظ غلام قادرؒ کے نورانی وجود کھڑے ہیں۔

احترامات کے ساتھ
ڈاکٹر فہمیدہ تبسم
☆ سربراہ شعبہ اُردو
وفاقی اُردو یونیورسٹی اسلام آباد

دیباچہ

☆سجاد بلوچ

شاہ صاحب کے نقوش حیات جو مجھے اپنے اپنے لگے

میرے لیے یہ بات باعثِ حیرت ومسرت تھی کہ میرے والد صاحب کے ایک پرانے دوست جو شاید ایک زمانہ پہلے ایک دوسرے سے جدا ہوئے اور اس کے بعد ان کی کوئی ملاقات بھی نہ ہوئی، ایک دن اچانک مجھ سے رابطہ کریں گے۔ یہ تھے سید مشتاق حسین شاہ صاحب۔ میں ان کے نام سے واقف تھا لیکن کوئی براہ راست رابطہ نہ تھا۔ ان سے جب بات ہوئی تو وہی بڑے بزرگوں والی حلیم الطبعی اور شفقت کی خوشبو محسوس ہوئی۔ انھوں نے اپنی آمدہ کتاب کا ذکر کیا اور اس کا مسودہ مطالعے کے لیے عطا کیا لیکن ساتھ ہی حکم بھی صادر کر دیا کہ میں اس کتاب کے بارے میں اپنی رائے دوں۔ یہ حکم میرے لیے گویا ایک امتحان تھا۔

کتاب کھولی تو آغاز ہی سے ایک طلسم نے اپنا اسیر کر لیا۔ وہ طلسم اس نسبت کا تھا جو مجھے بھی اپنی جنم بھومی سے ہے۔ شاہ صاحب نے باہتر کے جن کچے پکے رستوں کا ذکر کیا، مجھے ان پر سفر کرنا یاد ہے۔ اگرچہ وہ زیادہ عرصہ کو محیط نہیں رہا کیونکہ گاؤں سے باہتر تک کی سڑک اور نندنے کا پل تعمیر ہونے سے ہم جدید ہو گئے۔ گاؤں کے جس پرائمری سکول کا ذکر انھوں نے کیا اس سکول کے صحن میں میرا بچپن بکھرا پڑا ہے کیونکہ لڑکوں کا سکول نئی عمارت میں منتقل ہو جانے کے بعد وہ عمارت لڑکیوں کے سکول کو مل گئی اور وہاں میری والدہ پڑھاتی رہیں۔ یہ عمارت ملنے سے قبل لڑکیوں کا سکول ہمارے گھر میں تھا۔

شاہ صاحب نے گاؤں کا نقشہ کیا کھینچا گویا میرا دل کھینچ لیا۔ اگرچہ گاؤں اب وہ گاؤں نہیں رہا لیکن چونکہ دیہات میں زندگی کی تبدیلی کی رفتار شہر کی نسبت سست ہوتی ہے سو بہت کچھ اب بھی اپنی اصل حالت میں مل جاتا ہے۔ وہی پگڈنڈیاں، وہی پہاڑیاں، وہی پیڑ اور وہی کھیت ہمیں اپنی طرف بلاتے ہیں۔ میرا اور شاہ صاحب کا ایک دکھ مشترک ہے اور وہ ہے اپنی جنم بھومی سے دوری کا دکھ۔ وقت کا سیلاب ہمیں بہا کر کہاں سے کہاں لے گیا اور ہم دیکھتے رہ گئے۔ مجھے اپنا ایک شعر یاد آ رہا ہے جو یقیناً شاہ صاحب کی کیفیت کی ترجمانی بھی کرے گا کہ

میں پلٹ کے گاؤں نہ جا سکا، انھیں پھر گلے نہ لگا سکا
وہ شجر جو میرے لیے سدا مرے راستوں میں کھڑے رہے

ایک بات جو میرے لیے کافی حیرت کا باعث ہے وہ شاہ صاحب کے دور میں گاؤں کے پرائمری سکول میں بیت بازی کے مقابلے ہونا ہے۔ ہمارے عہد تک آتے آتے شعروشاعری کا ایسا کوئی رجحان تو نہیں رہا تھا البتہ ایک دو اساتذہ مجھے یاد ہیں جنھوں نے میرے ذوقِ سخن کو جلا بخشی۔ سید مشتاق حسین شاہ صاحب نے بعد کے ادوار کا ذکر بھی تفصیل سے کیا ہے جو خاصا دلچسپ ہے۔ کالج کے زمانے اور بعد کی زندگی میں بھی انھیں اپنے بچپن اور نوجوانی کا زمانہ بار بار یاد آتا ہے مثلاً جس طرح انھوں نے اپنے پوتے حمزہ کے کھلونوں کا ذکر کرتے ہوئے فتح جنگ کے بھادوں کے میلے کا احوال بیان کیا وہ اس بات کا ثبوت ہے۔ ہمارے ملک پر گزرنے والے عظیم سانحوں اور اہم واقعات کے رونما ہونے پر ایک سچے مخلص پاکستانی کے محسوسات اور عام لوگوں کے جذبات بھی انھوں نے جس طرح الگ باب میں رقم کیے وہ لائق تحسین ہے۔

شاہ صاحب نے پرائمری سکول کے جن اساتذہ کا ذکر کیا وہ اساتذہ اگرچہ ہمارے زمانے میں ریٹائر ہو چکے تھے لیکن گاؤں کی گلیوں میں پرانے شاگردوں پر ان کا رعب و دبدبہ برقرار تھا۔ بچپن کے وہ سارے کھیل جو وقت کی زنبیل سے گر کر کہیں کھو گئے تھے، شاہ صاحب کے قلم نے دوبارہ برآمد کیے ہیں اور ہمیں انھیں گلیوں میں لے گئے ہیں۔ نالہ نندنا کا ذکر خوبصورت پیرائے میں کیا ہے کہ جو گگھڑ کی خوبصورت وادی کے بیچ زمانوں سے بہہ رہا ہے اور آج بھی ہماری رگوں میں رواں ہے۔ شاہ صاحب نے گاؤں کے محنت کشوں کا ذکر جس محبت سے کیا ہے اس نے میرے دل میں ان کی قدر مزید بڑھا دی ہے۔ ایک اور خوبصورت یاد وہ پن چکی، یعنی جندر ہے جو مشینوں سے پہلے کی یادگار تھی۔

میرے لیے یہ کتاب یوں بھی اہمیت کی حامل ہے کہ میں نے جس گاؤں کو دیکھا اور جسے میں ہماری ثقافت کا آئینہ دار سمجھتا رہا اور جس کے رفتہ رفتہ کھوئے جانے کا قلق ہے، شاہ صاحب نے مجھے اس سے بھی پرانے گاؤں سے متعارف کروا کر میرے دکھ کو دوچند کر دیا ہے۔ اب مجھے گاؤں جا کر اپنی یادوں میں محفوظ گاؤں کی تہوں سے قدیم گاؤں کا کھوج لگانا ہوگا۔ یہ جانتے ہوئے کہ یاد تو خود ایک پرتو ہوتی ہے۔ مجھے اپنی

آنکھوں سے دیکھا ہوا گاؤں نہیں ملتا تو اس سے پرانا کہاں سے ملے گا لیکن یہی کھوج تو سفر کا حاصل ہے۔

اس کتاب کا کمال یہ ہے کہ یہ یادداشتیں عام طور پر شائع ہونے والی خودنوشتوں کی طرح مرصع اور افسانوی رنگ لیے ہوئے نہیں ہیں بلکہ ایک سچے اور مخلص انسان نے سادہ پیرائے میں اپنی زندگی کو من و عن اسی طرح پیش کرنے کی کوشش کی ہے جس طرح اس نے بتائی ہے۔ انھوں نے اپنا، اپنے خاندان کا، دوستوں کا اور گاؤں کا خوبصورت تعارف پیش کیا ہے اور بیچوں بیچ سلیقے سے ہماری تہذیب وثقافت کے رنگ اجاگر کر دیے ہیں۔ یہ بیانیہ اتنا سادہ اور دلکش ہے کہ شاہ صاحب اپنی یادوں کو دہراتے دہراتے چپکے سے ہمارا ہاتھ پکڑتے ہیں اور اسی زمانے اور انھی گلیوں میں لے جاتے ہیں۔ یہ کتاب ہمارے علاقے اور ہماری گم گشتہ تہذیب کی دریافت کی کوشش ہے۔ شاہ صاحب کو مبارک باد۔

سجاد بلوچ

لاہور، اکتوبر 2021

☆ ادیب شاعر، کالم نگار۔ لاہور

دیباچہ

☆ڈاکٹر اسد حسین شاہ

آپ میں، اور یہ کتاب

اس وقت جو کتاب آپ کے ہاتھ میں ہے، اس کے نفس مضمون سے خدا جانے آپ کس طرح اپنے آپ کو وابستہ ہوتا ہوا محسوس کریں گے...... اگر تو آپ صاحب تصنیف کے ہم عصر ہیں تو ظاہر ہے عصری لحاظ سے کتاب میں درج بہت سے مناظر آپ کو اپنے ماضی کی طرف دھکیل دیں گے...... اگر آپ کا تعلق بھی اسی علاقے سے ہے جس جگہ سے صاحب کتاب آبائی تعلق رکھتے ہیں تو آپ کیلئے اس کتاب سے نسبت اور تعلق کا احساسِ بھی دوچند ہو جائے گا...... اگر آپ مصنف کو ویسے ہی عام زندگی میں جانتے ہیں تو یہ احساس بھی کتاب سے ایک محبت آمیز تعلق کیلئے کافی ہے......

میرا تو حال یہ ہے کہ گویا یہ کتاب لکھی ہی، میرے لیے، گئی ہے...... لکھنے والے میرے لیے گہرا نسبی وقلبی واسطہ رکھتے ہیں کیونکہ میرے شفیق عمی محترم ہیں...... لیکن اس کے علاوہ جس پرائمری سکول میں انہوں نے پڑھا، جس گاؤں میں اپنا بچپن گزارا، جن گلیوں میں کنچے کھیلے، جن کھیتوں میں کبڈی دیکھی، جن ہمسائیوں، گاؤں والوں اور پیشہ وروں کو کتاب میں اکٹھا کیا، وہ سب میری یادوں میں، میرے دل میں، میرے شعور اور لاشعور میں رہتے، بستے، کھیلتے، کھلکھلاتے، ہنستے، روتے ہیں...... زمانی لحاظ سے بھی میرے بچپن تک اس علاقے کے معاشرتی اور ثقافتی حالات تقریباً ویسے ہی تھے جیسے اس کتاب میں بیان کیے گئے ہیں...... اس لیے جیسے جیسے کتاب آگے بڑھتی گئی ویسے ویسے میرے لیے بھی ماضی کے دریچے وا ہوتے چلے گئے...... اس لیے یہ کتاب میرے لیے ایک کتاب سے کہیں بڑھ کر یادوں کا ایک بیش قیمت، نادر اور حسین خزانہ ہے...... کتاب کو پڑھتے ہوئے بارہا ایک مصرع ذہن میں گونجتا رہا......

''دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو''

لیکن اگر آپ ایک ایسے قاری ہیں جن کا زمانی یا مکانی تعلق اس کتاب سے دور کا بھی نہیں یعنی آپ کسی اور گاؤں، شہر یا ملک سے تعلق رکھتے ہیں یا زمانے کے لحاظ سے بھی آپ بیسویں صدی عیسوی کے اواخر یا

اکیسویں صدی میں پیدا ہوئے، تو بھی یہ کتاب ایک ایسا آئینہ یا پردہ سیمیں ہے جس میں آپ ایک پورے عہد، ایک مکمل ثقافت اور ایک جداگانہ معاشرت کو پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر دیکھ سکتے ہیں............ یہ کتاب کوئی عام تحریر نہیں بلکہ ایک تاریخی دستاویز ہے، ایک خوبصورت پینٹنگ'' ہے، ایک دلچسپ فلم ہے......''

آپ جو کوئی بھی ہیں اور جہاں کہیں بھی ہیں، اگر یہ کتاب آپ کے ہاتھ میں ہے تو ٹھہر ٹھہر کے پڑھیئے، اس کا مزا لیجئے، اور پھر اسے سنبھال کے رکھیئے............ یہ آنے والی نسلوں کیلئے لکھی گئی ہے۔

مصنف کی قلم اور یادوں پر گرفت غیر معمولی اور انتہائی قابل تعریف ہے...... ایسی تحریریں لکھنے کیلئے کسی کا ایک عبقری شخصیت ہونا ضروری ہے اور یہ محض خدا کی عطا ہے۔

فقط..................

ڈاکٹر اسد حسین شاہ

☆ معروف معالج ۔ اٹک شہر

دیباچہ

☆ڈاکٹر وسیم انجم

سید مشتاق حسین شاہ بخاری ضلع اٹک تحصیل فتح جنگ (علاقہ نلہ) کے سید زادے ہیں۔آپ کی ولادت 28 فروری 1947ء میں ہوئی لیکن سرکاری کاغذات میں یکم مارچ 1947ء ہے۔قرآن پاک اپنی والدہ ماجدہ سے پڑھنے کے بعد گاؤں کے سکول میں داخل ہوگئے۔ گورنمنٹ ہائی سکول باہتر سے میٹرک کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج اٹک میں پڑھتے رہے اعلیٰ تعلیم کے لئے پنجاب یونیورسٹی کا رخ کیا۔تعلیم مکمل کرنے کے بعد درس و تدریس کے عظیم پیشے سے وابستہ ہوگئے۔خیبر پختونخواہ کے مختلف تعلیمی اداروں میں اپنے فرائض ادا کرنے کے بعد گورنمنٹ سینٹینیل ماڈل ہائی سکول پشاور کینٹ سے 37 سالہ ملازمت کرنے کے بعد 28 فروری 2007ء کو سبکدوش ہوگئے۔

حیات مبارکہ کے 75 ویں سال اپنی زندگی کے حالات، واقعات، تجربات و مشاہدات کو ''نقوشِ حیات'' میں محفوظ کر دیا ہے۔ان کے خاندان کے بزرگوں اور ان کے اساتذہ کرام نے ان کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔انہوں نے ابتدائی زمانہ طالب علمی میں ماہنامہ ''بچوں کی دنیا'' میں لکھنے کا آغاز کیا اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ گورنمنٹ کالج اٹک میں بڑے نامور ادباء شعراء سے وابستہ رہے وہاں انہیں ڈاکٹر غلام جیلانی برق، پروفیسر سعد اللہ کلیم اور پروفیسر وقار بن الٰہی ایسی شخصیات سے پڑھنے کا موقع ملا اور پنجاب یونیورسٹی میں ڈاکٹر شوکت علی صدیقی نے ان کی داخلی اور خارجی زندگی کے اہم پہلوؤں کو اُجاگر کیا۔

''نقوش حیات'' میں اپنے خاندانی شجرۂ نسب کے علاوہ علاقے کے رسم و رواج اور وہاں کی سرگرمیوں کے ساتھ لوگوں کے پیشوں اور تاریخی مقامات کو اجاگر کیا ہے۔حتیٰ کہ کسانوں کے بارے میں ادباء وشعراء کی نظم و نثر سے مثالیں پیش کی ہیں۔ایک جگہ جوش ملیح آبادی کی نظم ''کسان'' بھی شامل اشاعت کر کے کسانوں اور زندگی کے دیگر پیشوں سے وابستہ محنت کشوں کی تصویر کشی بہت عمدہ پیرائے میں کی ہے۔اس طرح اپنے اساتذہ کرام کی عظمت اور ان کی کردار سازی میں ان کے کردار کا اعتراف بڑے سلیقے سے کیا ہے۔

مصنف نے اپنی زندگی کے حقائق کو حقیقت پسندی سے بیان کرتے ہوئے اپنی بیماریوں اور حادثات کے مناظر دلچسپ انداز میں بیان کئے ہیں۔ حالانکہ اپنی ذات کے بارے میں لکھنا مشکل امر ہے۔ ''نقوش حیات'' میں انہوں نے حالات زندگی جامعیت، غیر جانبداری، بے لاگ صداقت سے واقعات کو مشاہدات کی کسوٹی پر رکھ کر کیا ہے، جس کی ایک تخلیق کار سے توقع ہوتی ہے۔

اس کتاب میں ان کے بچپن سے دسمبر 2014ء سانحہ آرمی پبلک سکول تک کے واقعات نمایاں ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ یہ کتاب قارئین کرام کو مختلف زاویوں سے متاثر کرے گی......ان شاءاللہ۔

☆ سابق انچارج شعبہ اردو
وفاقی اردو یونیورسٹی اسلام آباد

’’نقوشِ حیات‘‘ پر ’’تاثراتِ چراغ‘‘

یہ چند سطور عزیزم مشتاق حسین صاحب کی تیسری تصنیف ’’نقوش حیات‘‘ جوان کے بچپن لڑکپن جوانی اور حالیہ پیرانہ سالی کی چند یادداشتوں کا مجموعہ ہے، کا مقدمہ دیباچہ، تبصرہ یا تعارف نامہ نہیں ہے بلکہ کتاب مذکورہ کے مندرجات کے بارے میں اپنی ماضی کی یادوں کی روشنی میں میرے اپنے چند ذاتی تاثرات ہیں۔

محترم مصنف کئی واسطوں سے میرے ہم جد رشتہ دار ہیں پھوپھی زاد بھی اور خالہ زاد بھی۔ اسی طرح ان کے والد صاحب مرحوم کا شمار میرے ددھیالی اور ننھالی دونوں اطراف کے بزرگوں میں سے تھا۔ اس لیے ان کے جنم بھومی وادی نلہ واقع مابین پہاڑ کالاچٹا اور نالہ نندنا بسلسلہ کسی نا کسی خاندانی تقریب میں آنے جانے اور کئی دنوں تک قیام کا موقع ملتا رہا۔ کالاچٹا کی پہاڑیوں میں شکار کھیلنے اور نالہ نندنا کی بھپری ہوئی سرکش اور زور آور موجوں کا تماشا اور نظارہ دیکھنے کا بھی موقع ملتا رہا۔

جرم ضعیفی کی سزا:

کالاچٹا میں تو مَیں نے اپنی زندگی کا پہلا اور آخری شکار کھیلا۔ میرے پھوپھی زاد اور تقریباً" ہم عمر بھائی حبیب اللہ شاہ ساتھ تھے۔ ان کے ہاتھ میں ایک چَھرے دار بندوق تھی۔ ایک جگہ سامنے پہاڑی پر ایک معصوم فاختہ اپنے انجام سے بے خبر بیٹھی تھی۔ حبیب اللہ شاہ نے بندوق مجھے تھما دی میں نے زمین پر لیٹ کر نشانہ لیا اور فائر کر دیا۔ شومیِ قسمت نشانہ صحیح نکلا بھائی حبیب اللہ شاہ چوکڑیاں بھرتا ہوا دوسری پہاڑی پر جا پہنچا۔ اور اپنی جیب سے چاقو نکال کر ننھے شکار کو ذبح کر کے ساتھ لے آیا۔ شام کو کھانے کے وقت اسے جب پلیٹ میں بھنا ہوا موجود پایا تو بے حد افسوس ہوا۔ اندر دل میں شدید نفسیاتی گھبراہٹ اور اعصابی بے چینی کی ایک لہر دوڑتی محسوس ہوئی کہ یہ میں نے کیا کیا؟، فاختہ جو دنیا میں امن۔ آشتی اور معصومیت کی نشانی سمجھی جاتی ہے۔ اس نازک معصوم ذی روح کی جان لینا میرے لیے ایک اندرونی اذیت اور سوہان روح عمل بن گیا۔ اس واقعہ کے بعد پرندوں اور جانوروں کے شکار سے نفرت سی ہوگئی۔ اس وقت میری حالت عربی زبان کے شاعر اور فلسفی ابوالمعلا معری جیسی بن گئی کہتے ہیں ایک دوست نے ایک بھنا ہوا تیتر بھیجا۔ معری گوشت کھانے سے اجتناب کرتا تھا۔ اس نے اس خوانِ تازہ سے ہاتھ اٹھا لیے۔

اقبال نے معری کی اس نفسیاتی نازک قلبی طبیعت کو اپنے اشعار میں ایک عبرت آموز انداز میں

بیان فرمایا ہے۔ فاختہ تو تیتر سے بہت زیادہ ضعیف و ناتواں اور معصوم پرندہ ہے۔ اس جرم ضعیفی کا ارتکاب میرے لیے ایک بڑا ذہنی صدمہ ثابت ہوا۔ اس کے بعد جب بھی اس قسم کا نشانہ لینے کا موقعہ ملا تو اپنی ہی جان کو زخمی کر بیٹھا۔ وادیِ بائینہ (درمیان اضلاع لکی مروت اور ٹانک) میں ماضی کے اس جرم کا کفارہ مجھے ابتک یاد ہے۔ اور پھر ڈیپریشن (بے چینی اور پژمردگی) اور خوف و دہشت (اینگسایٹی) کا ایک خاصا طویل دور مجھ پر گذرا۔ تکلیف اور اضطراب کا وہ زمانہ یاد آتا ہے۔ تو اختر انصاری کا یہ شعر بھی ذہن کے پردے پر بطور درمان بیچارگی ماضی جلوہ افروز ہو جاتا ہے:

یادِ ماضی عذاب ہے یا رب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

نالہ نندنا کا ایک سبق آموز نظارہ:

لالا فدا حسین (برادر اکبر مشتاق حسین صاحب) کی شادی کی تقریب کے موقع پر ڈولی موضع لنگر سے موضع گکھڑ لا رہے تھے۔ نالہ نندنا دونوں مواضعات کے درمیان بہتا ہے۔ روانہ ہوتے وقت موسم مناسب تھا۔ لیکن اچانک راستے میں بارش کی پھوار پڑنے لگی۔ آگے نالہ نندنا میں ایک طوفان برپا تھا۔ پار کرنے کی سکت و ہمت نہ تھی اور کافی دیر تک نالے کے کنارے سب باراتی انتظار کرتے رہے۔ بارش کی وجہ سے سب لوگ بھیگ کر ادھر ادھر جائے پناہ کی تلاش میں سرگردان بھاگ رہے تھے۔ دلہن کو بچانے کیلیے ڈولی کو الٹا کر اس کے سر پر بطور چھتری ڈالنا پڑا۔ اس موقع پر میرا اکرم خان خواجہ خیل جو بزرگوارم پیر صاحب (رح) کے ایک پر خلوص اور خوش مزاج مریدِ خاص تھے مزاحاً'' کہنے لگے'' اے پیرزادو! اگر مستقبل میں پھر کبھی نالہ نرڑہ (نندنا) کے اس پار آپ لوگوں کو سات دلہنیں بھی ملیں تو ہاں نہ کہنا"۔

ہائے وہ دعوتِ شیراز:

ان دنوں یہ دستور تھا کہ دور بیاہی بہن بیٹی بمع اپنی اولاد کے دس پندرہ دن تک شادی کے گھر میں مہمان رہتی۔ بزرگوارم پیر صاحب بابا جی (علیہ رحمہ) کا نندنا نالے پر آٹے کا جندر (پن چکی) تھا۔ ساتھ ہی ان کا مرغیوں کا فارم (پولٹری فارم) تھا۔ اس لیے ہمیں روز کھانے میں مرغی کے گوشت کیسا تھ ماسی صاحبہ (مرحومہ) کے ہاتھوں کا تیار کردہ مزیدار اور خوش ذائقہ اچار ملتا تھا۔ یہ سلسلہ دو ہفتے تک لگاتار جاری

رہا۔ پندرویں اور آخری روز لذیذ مسور کی دال سامنے رکھ دی گئی۔ یہ منہ اور مسور کی دال کے تاریخی محاورے کی بجائے پشتو کا یہ ضرب المثل میری زبان سے نکلا:

؎ نن دے چہ را کڑہ پیتی۔ جوڑہ رادے کڑہ رخصتی

(ترجمہ: آج جو آپ کے ہاتھوں سے مسور کی دال ملی۔ گویا ہمیں رخصتی کا سندیسہ مل گیا)۔

بعد میں اپنے ملک اور بیرون ملک سیون سٹار ہوٹلوں اور کلبوں میں شاندار مرغن بوفے کھانے کو ملے لیکن سچ تو یہ ہے کہ لڑکپن کی اس شادی کے کھانوں مرغی۔ اچار اور مسور کی دال کی لذت جب یاد آتی ہے۔ تو ساتھ ہی اردو کا یہ شعر گنگنانے کو دل چاہنے لگتا ہے:

؎ ماضی میں جو مزا میری شام و سحر میں تھا
اب وہ مزہ تصور شام و سحر میں ہے

کتاب ہٰذا کے مندرجات:

فاضل مصنف نے اپنی ان یاداشتوں میں نہایت پیارے سیدھے سادھے۔ سچے۔ حقیقت پر مبنی روان ادبی زبان میں پنجاپ کی دیہاتی۔ ثقافتی اور سماجی زندگی کو ایک پر لطف نثری رنگ اور اسلوب میں بیان اور پیش کیا ہے۔ آج سے نصف صدی قبل ایک دور پسماندہ گاؤں کے زندہ دل۔ سادہ لوح اور جفاکش پنجابی دہقان کی روزمرہ معاشرتی زندگی کی ایک دلکش سچی تصویر کشی کی گئی ہے۔ ایک جاگیر دارانہ نظام جو اب تقریباً ''دم توڑ رہا ہے'' میں جاگیر دار۔ پیر۔ ملا۔ حکیم اور پیشہ ور ہنرمندوں کی ضرورت۔ مانگ اور کردار کو تفصیل کیساتھ اُجاگر کیا گیا ہے۔ یہ ہنر مند افراد جو آج کل کے فن کار۔ اُستاد۔ انجینئر اور ڈاکٹر ہیں اس وقت کی دیہاتی زندگی میں مثلِ جسم ریڑھ کی ہڈی کا اہم فریضہ انجام دیتے تھے۔

انگریزی نظم:

فاضل مصنف نے گاؤں کے جفاکش۔ آتش و آہن کے کھیل کے محنت کش کاریگر کو انگریزی شاعرِ فطرت ورڈز ورتھ کی ایک نظم ''بلیک سمتھ'' کو نقل کر کے نہ صرف اس کے کسان کیلیے زرعی آلات تیار کرنے کے کسب کو خراج تحسین پیش کیا بلکہ کالج کے زمانے سے ذہن کے پردے پر نقش اس نظم کو پڑھانے والے استاد کی شخصیت اور انکے فن تدریس کے جوہر کی یاد بھی تازہ کر دی ہے۔ کاش! وہ اس انگریزی فن پارے کو اپنے کسی

شاعر دوست کی عرق ریزی سے اُردو زبان کے قالب میں ڈھال دیتے۔تو نہ صرف اُردو قاری اس نظم کو بہتر طور پر سمجھ پاتا بلکہ اردو ترجمہ ادب میں بھی ایک قابل قدر اِضافہ ثابت ہوتا......(تعمیلِ ارشاد۔مؤلف)

باباسائیں حاضر کا میلہ:

عزیز مصنف نے اس کتاب میں فتح جنگ (اٹک) میں باباسائیں حاضر اور موتیاں والی سرکار کے ایک میلے کا ذکر کیا ہے اور بزرگوں کی اس نصیحت بھرے فارمولے کہ "پھر ٹُر کر دیکھو" پر عمل کر کے بچپن کی محرومی اور نارسائی کے زمانے کو یاد کیا ہے۔ میں یہاں اِنشاء جی کی ایک شہکار نظم کا ذکر کر کے ان کے ماضی کی اس نارسائی کے دور کے زخم پر مرہم رکھنا چاہتا ہوں۔

ایک چھوٹا سا لڑکا تھا میں جن دنوں
ایک میلے میں پہنچا ہمکتا ہوا
ایک ایک شے پہ دل تھا مچلتا میرا
جیب خالی تھی کچھ مول لے نہ سکا
خیر محرومیوں کے وہ دن تو گئے
آج میلہ ہے اسی شان سے
آج چاہوں تو ایک ایک دکان مُول لوں
نارسائی کا جی میں وہ دھڑکا نہیں
پر اجڈ سا وہ چھوٹا سا لڑکا نہیں

کیمبل پور کالج:

اس قدیم کالج سے راقم الحروف کا بھی ایک پرانا تعلق اور شغف بنتا ہے۔ ہمارے مرحوم والد صاحب قدس سرہ اُن ہی ابتدائی سالوں 25-1924 میں اس کالج کے طالبعلم رہ چکے تھے۔اس وقت کے ہندوستان کے چیدہ چیدہ نامور عالم اساتذہ یہاں پڑھاتے تھے۔ ماضی قریب کے ایک عالم و فاضل لائبریرین چوہدری غلام نذر صابری (مرحوم) سے بھی میرا کافی عرصہ قلمی تعلق رہا۔ وہ اردو اور فارسی علوم میں ید طولی رکھتے تھے۔

انجمن نوادرات علمی اٹک کے بانی ارکان میں سے تھے۔آج کل انکے ایک فیض یافتہ شاگرد محترم راجہ نور محمد نظامی صاحب انکے کاہائے نمایاں اور وسیع تعلقات کو خوب نبھار ہے ہیں۔

کیمبل خاندان:

سابقہ ضلع کیمبل پور اور حال اٹک کا نام برطانوی کمانڈر ان چیف سر کولن کیمبل کے نام سے 1903ء میں رکھا گیا۔کیمبل خاندان کا اصل تعلق سکاٹ لینڈ (برطانیہ) کے ساتھ تھا۔میں نے اپنے سکاٹ لینڈ کے سفر نامے میں اس خاندان کی تاریخ۔شہرت عام اور تاریخی محل ''انویری پیلس'' کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔مغرب کا ڈیوک ہو کہ ہمارے ہاں کا کوئی نواب تاریخ کے ہر دور میں ان کے اطوار۔زندگی کی سج دھج۔زورو ظلم کی روایات اور سازشی کھینچا تانی کے حربے یکساں ہوتے ہیں۔

معزز قارئین کی معلومات کیلیے عرض ہے۔کہ اس خاندان کی وطن فروشی کی صدیوں پرانی سرشت کی وجہ سے ان کے ہموطن بھی انہیں ''ضدی اور حریص کیمبلز'' پکارتے ہیں۔ایسے ایک معیوب اخلاق کے مالک شخصیت کے نام پر اس مملکت خداداد کے ایک شہر کو منسوب کرنا اہلیان اٹک کو گوارہ نہ ہوا۔اور کیمبل پور کا نام بدل کر دوبارہ اٹک رکھ دیا' جو نام پانینی اور پھر اکبر بادشاہ کے وقتوں سے رائج تھا۔گراں قدر مصنف نے اپنی کتاب زیست میں دلچسپ۔عجیب وغریب اور مافوق الفطرت واقعات اور تواہمات کو بڑے مزیدار انداز سے اور رواں سلیس اردو میں بیان کیا ہے۔

مشاغل (ادبی،سماجی،معاشرتی اور فلاحی):

مشتاق حسین صاحب گیسوئے اردو کو نکھارنے،سنوارنے اور اسے مطابق آئین اور عدالت عالیہ کے ایک حکم کے تحت قومی زبان بنانے کی مہم چلا رہے ہیں۔تحریکِ نفاذ اردو سے دلی تعلق اور وابستگی رکھتے ہیں۔ بلکہ اس کے سرپرستوں میں شمار ہوتے ہیں۔'' حکیم محمد سعید (رح) فاؤنڈیشن'' کے روح، رواں ہیں۔حکیم صاحب مرحوم کی شخصیت اور خدمات پر کافی کچھ لکھ چکے ہیں۔طالب علمی کے زمانے سے سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہے ہیں۔کالج کے دنوں میں جماعت اسلامی سے وابستہ جمیعت طلباء سے تعلق رہا۔اور اس سیاسی اور مذہبی تحریک کو خون جگر دیتے رہے۔آجکل تحریک انصاف سے اُمیدیں،وابستہ کررکھی ہیں۔کافی عرصے سے ایک پرائیویٹ سکول الفیصل ماڈل ہائی سکول کے بانی منتظم اور سرپرست اعلیٰ ہیں۔کئی نصابی اور ادبی کتابوں

کے مصنف ہیں۔مشہور ''روٹری کلب'' نامی فلاحی ادارے سے وابستہ ہیں۔ملکی اور بین الاقوامی اساتذہ کی تنظیموں کے فعال کارکن ہیں۔اس سلسلے میں کافی ممالک کی سیر کر چکے ہیں۔ارض مقدس مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں مہینوں اپنے بچوں کے ہاں قیام پذیر رہ چکے ہیں۔اپنے خاندان کے افراد کے ہمراہ مشہد شریف، قم شریف (ایران) اور کوفہ و نجف شریف (عراق) کی زیارات مقدسہ سے مشرف اور فیض اہل بیت اطہار حاصل کر چکے ہیں۔ان مقامات مقدسہ کے سفر نامے زیرِ طبع ہیں۔ایجوکیٹر نامی رسالہ نکالتے رہے ہیں۔اس کے سرپرست اور مدیر رہے ہے۔وہ گونا گوں تعمیری اور مثبت صلاحیتوں سے بھرپور ایک متحرک شریف النفس۔ملنسار اور مرنجا مرنج ساتھی سمجھے جاتے ہیں۔اس کتاب کی غرض و غایت ساحر لدھیانوی کے بقول

دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے، وہ لوٹا رہا ہوں مَیں

انہوں نے اپنی جہد مسلسل سے بھرپور توانا ۷۳ سال زندگی کے تجربات و حوادث۔بچپن کی گل بانگ کھلکھلاہٹیں اور ولولوں۔جوانی کی تمناؤں اور اُمنگوں، بڑھاپے میں بھی قائم ایک انداز بانکپن۔مختلف بیماریوں۔خوشیوں۔تلخیوں۔دکھوں۔شادمانیوں۔محرومیوں اور خداداد نعمتوں کو اپنے قلم کی طاقت اور زبان و بیان کا حسن دے کر امر بنا دیا ہے۔

ڈاکٹر سید چراغ حسین شاہ

☆ معالج، محقق، مصنف اور دانشور

حیات آباد پشاور۔۵ نومبر ۲۰۲۱ء

میرے بچپن کے دن

لگ بھگ ستر برس پہلے کی ابتدائی یاداشت جو میرے ذہن میں محفوظ ہے، مہینہ یاد نہیں مگر سال بتا سکتا ہوں کہ یہ 1951ء کے ابتدائی مہینے ہوں گے۔ میرے والد بزرگوار حج پر تشریف لے گئے تھے۔ اور انہوں نے اپنی مرتب کردہ (نامکمل) خودنوشت یادداشتوں میں حج کے سال کا ذکر کیا ہے لہٰذا میں ان کی تحریری یاداشت کی بنیاد پر ہی اسے ستر برس پہلے کا واقع کہہ رہا ہوں۔

میری عمر اس وقت چار سال یا اس سے کچھ کم ہوگی۔ میرے ذہن میں والد مرحوم کی حج پر روانگی کے ابتدائی واقعات کی کوئی یاداشت محفوظ نہیں البتہ میرے بڑے بھائی سید قربان حسین شاہ جو عمر میں مجھ سے لگ بھگ آٹھ برس بڑے ہیں، والد صاحب کی حج پر روانگی کی اپنی یاداشتیں بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ اور ہمارے برادر بزرگ سید محمد حسین شاہ اس وقت موضع باہتر (ضلع اٹک) کے مڈل سکول میں پڑھتے تھے۔ گاؤں کو کسی طرف سے کوئی کچی یا پکی سڑک نہیں جاتی تھی۔ چنانچہ والد صاحب کو حج مبارک پر روانہ ہونے پہلے ''باہتر اڈے'' پر جانا تھا۔ باہتر جانے کے لیے اُس وقت ایک کچے پہاڑی راستے پر چار پانچ کلومیٹر کا فاصلہ پیدل طے کرنا ہوتا تھا۔ برادرم موصوف کی یادداشت کے مطابق گاؤں کے چند افراد کے ساتھ وہ دونوں بھائی بھی باہتر اڈے تک انہیں رخصت کرنے گئے تھے اور لنگر سے برادرم سید محمد اکرم شاہ بھی والد صاحب کو رخصت کرنے باہتر آئے ہوئے تھے۔ باہتر اڈے پر رخصت کرنے کے لئے انہیں حسن ابدال جانے والے ٹانگے پر بٹھایا کیونکہ غالباً اُس وقت تک حسن ابدال جانے کے لیے کوئی بس وغیرہ بھی شروع نہیں ہوئی تھے۔ والد صاحب کو رخصت کرنے کے لئے انہیں پتہ نہیں کتنی دیر اڈے پر رکنا پڑا ہوگا۔ لہٰذا اُس دن انہیں اسکول سے چھٹی کرنا پڑی۔ ان کے کہنے کے مطابق اگلے دن جب وہ سکول گئے تو غیر حاضری کی بنا پر ان کے کلاس ٹیچر نے انہیں ہیڈ ماسٹر کے سامنے پیش ہونے کے لیے کہا۔ ہیڈ ماسٹر محترم کا نام وہ میر داد میرؔ بتاتے ہیں جنہیں عام طور پر میرؔ صاحب کہا جاتا تھا۔ اُن کے کہنے کے مطابق جب انہیں میرؔ صاحب کے سامنے سزا کے لیے پیش کیا گیا تو انہوں نے ہمیں دیکھتے ہی کلاس ٹیچر سے کہا کہ "ارے تمہیں پتہ ہے کہ یہ کون ہیں اور کل سکول کیوں نہیں آئے؟ یہ اپنے والد کو رخصت کرنے آئے تھے اور ان کے والد ایسی جگہ جا رہے تھے جس کا ہم خواب بھی نہیں دیکھ سکتے۔" وہ بتاتے ہیں کہ ہیڈ ماسٹر میرؔ صاحب باہتر گاؤں کے دیگر لوگوں کے ہمراہ ہمارے والد

صاحب کو رخصت کرنے کے لئے بذات خود اڈے پر تشریف لائے تھے۔ پھر انھوں نے ہمیں کہا کہ جاؤ بیٹا اپنی اپنی کلاسوں میں جا کر بیٹھو اور ہاں شاہ صاحب کو خط لکھو تو میرا مؤ دبانہ سلام بھی لکھنا اور لکھنا کہ میرے لیے بھی روضۂ رسول ﷺ پر دعا کریں۔

میری پہلی یاداشت:

یہ تو تھیں برادرم قربان حسین شاہ کی یاداشتیں جن کے ساتھ میری بچپن کی یہ یاداشت بھی محفوظ ہے۔ اپنی اہمیت کے لحاظ سے یہ واقعہ اتنا اہم نہیں مگر میرے ابتدائی بچپن کے واقعات میں یہی واقعہ میرے ذہن میں محفوظ ہے۔ اس لیے اس کا ذکر کر دیا۔ تاہم جب والد مرحوم حج کی سعادت حاصل کرنے کے بعد واپس تشریف لائے تو مجھے اتنا یاد ہے کہ میں اپنے گھر کی ڈیوڑھی کے سامنے والے گھر کی پچھلی دیوار کے ساتھ گلی میں کھڑا تھا۔ مجھے نہیں یاد کہ والد مرحوم کے استقبال کے لئے آجکل کی طرح کسی بڑے جلوس کا اہتمام تھا۔ نہ تو اُس وقت ٹیلی فون یا موبائل کا انتظام تھا کہ وہ اپنے آنے کی قبل از وقت اطلاع کرتے اور اُس زمانے میں خطوط پہنچنے میں بھی مہینوں کا عرصہ لگ جاتا اتنا یاد ہے کہ ان کے گھر پہنچنے سے قبل پتہ نہیں کِس ذریعے سے گاؤں میں اطلاع ہو چکی تھی کہ کچھ اور لوگ بھی میری طرح ہمارے گھر کے سامنے گلی میں انتظار میں کھڑے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ وہ اپنی آمد کے وقت ہمارے گھر کی گلی کے پہلے موڑ پر جب سامنے نظر آئے تو ان کے پیچھے گاؤں کے لوگوں کا ایک جمِ غفیر بھی تھا جو سُن سُنا کر اُن کے استقبال کے لیے پہنچ گئے تھے والد مرحوم آگے آگے تھے، میں اُسی طرح دیوار کے ساتھ کھڑا تھا۔ وہ میرے قریب پہنچے تو مجھے اٹھا کر گلے لگایا اور پھر جلد ہی مجھے اتار کر خود آگے بڑھے اور گھر جانے یا گھر کے ساتھ گلی میں بیٹھک (حجرے) میں جانے کی بجائے نوافل شکرانہ کی ادائیگی کیلئے مسجد کی طرف روانہ ہو گئے۔ میرے ذہن میں اس استقبال کی یہی کچھ جھلک سی موجود ہے جس کو میں اپنے بچپن کی ذہن میں رہ جانے والی پہلی یاداشت کے طور پر قلمبند کر رہا ہوں۔

بچپن کی کچھ یادیں میں نے اپنی ابتدائی تعلیم کے بارے میں بیان کی ہیں مگر سکول سے باہر اور گھر کے اندر بھی ایک زندگی ہوتی ہے۔ دوست، کھیل کود، کام کاج، رہن سہن، بھائی بہن اور رشتہ دار، گاؤں، کھیت کھلیاں، گاؤں کے نالے پہاڑ اور جنگل۔ ان سب کے ساتھ کچھ نہ کچھ یادیں ضرور وابستہ ہوتی ہیں۔ چلیں آغاز اپنے گھر اور خاندان سے کرتا ہوں۔

میرے دونوں والدین یعنی والد اور والدہ کے کوئی حقیقی بھائی نہیں تھے لہٰذا ہم ماموں اور چچا کے حقیقی رشتوں سے دائمی طور پر محروم تھے۔ البتہ دونوں والدین یعنی والد بزرگوار اور والدہ محترمہ کو اللہ تعالیٰ نے ایک ایک بہن کے رشتے سے نوازا تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ میرے بہت بچپن میں میری خالہ سکینہ بی بی حیات تھیں اور والد صاحب کی تحریر کردہ یاداشت (برصفحہ اول اول کتاب رحمت اللعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) 23 اپریل 1947ء یعنی میری پیدائش کے تقریباً ایک ماہ بعد وفات پا گئیں۔ ہماری پھوپھی مرحومہ عائشہ بی بی میری یاداشت سے پہلے ہی کوہاٹ اور میانوالی کے درمیان علاقہ بانگی خیل خٹک کے ایک دور دراز گاؤں تبی سر میں ہمارے اپنے سادات خاندان میں بیاہ دی گئی تھیں۔ لہٰذا ان دونوں رشتوں کے ہوتے ہوئے بھی میرے ذہن میں اُن کی بچپن کی کوئی یادداشت محفوظ نہیں ہے (البتہ اپنی عمر کے چودہویں سال میں اپنے والد مرحوم کے ہمراہ اُن کے گاؤں تبی سر بھی گیا تھا۔ اٹھارہ میل پیدل کا یہ بھی ایک دلچسپ سفر تھا جس کا ذکر مناسب وقت پر کہیں پر ہو جائے گا۔

میرے والد مرحوم اور والدہ مرحومہ کثیر العیال تھے۔ ہماری دو والدہ تھیں۔ ایک موضع لنگر (ضلع اٹک) اور دوسری موضع گکھڑ (ضلع اٹک) میں رہائش پذیر تھیں۔ ہم اپنی والدہ مرحومہ بی بی مدینہ خانم سے چھ بھائی (سید فدا حسین شاہ، سید محمد حسین شاہ، سید قربان حسین شاہ، سید مشتاق حسین شاہ (راقم)، سید علی حیدر شاہ اور سید سجا حسین شاہ اور ایک بہن سیدہ شہناز بی بی یعنی سات بچے تھے۔ جب کہ ایک بہن سیدہ ممتاز بی بی چھ سات سال کی عمر میں میری یاد سے پہلے فوت ہو گئی تھیں اور دوسری والدہ سے تین بھائی سید محمد اکرم شاہ، سید حمید شاہ اور سید عنائت حسین شاہ تھے۔

میرے والد بزرگوار پیر سید محمد علی شاہ:

مجھے یہ سعادت حاصل ہے کہ میں نے اپنے والد بزرگوار مرحوم کی زندگی پر ایک مکمل کتاب لکھ کر طبع بھی کروالی ہے۔ اگر ان کا ذکر یہاں بھی تفصیل سے کروں تو اس کتاب کی ضخامت اسے برداشت نہ کر سکے تاہم مختصراً عرض کرتا چلوں کی والدم مرحوم دینی مدرسوں کے سند یافتہ، عربی اور فارسی کے متبحر عالم تھے۔ مگر ان کی زندگی موجودہ دور کے ''علماء'' کی طرح پیشہ وارنہ نہیں تھی۔ وہ عالم دین تھے مگر پیشہ زراعت، تجارت اور کھیتی باڑی رہا۔ وہ ایک صوفی اور پیر طریقت تھے، سینکڑوں مریدین تھے مگر کوئی درگاہ یا آستانہ ٹائپ چیز قائم نہ کی۔ خود

دینی اور قدیمی علوم کے ماہر تھے مگر ہمیں دینی علوم کے ساتھ ساتھ دُنیوی تعلیم بھی دِلوائی۔ حکیم تھے مگر اپنی جیب سے خرچ کر کے داوئیاں اور نسخے تیار کرتے اور بیماروں اور مریضوں سے زندگی بھر ایک پیسہ بھی وصول نہ کیا۔ 1951ء میں اس وقت سفرِ حج پر گئے جب بہت کم لوگوں کو یہ سعادت نصیب ہوتی تھی۔ ان کی زندگی کی کچھ تفصیل اس کتاب میں کہیں کہیں درج ہے مگر یہاں ان کے لباس اور حلیہ کے بارے میں مختصراً بیان کرتا ہوں۔

میرے والد بزرگوار کی جوانی کے وقت کا حلیہ اوران کا لباس مجھے یاد ہے۔ وہ سفید براق لباس کی قمیض شلوار پہنتے تھے۔ سر پر سفید پگڑی اوراس پر مزید سفید لٹھے کی چادراوڑھتے تھے۔ پگڑی کے اوپر والی چادر کی وہ اس طرح بُکل نکالتے تھے کہ اس میں ان کا چہرہ تقریباً چھپ جاتا تھا اور داڑھی مکمل چھپی ہوتی تھیں۔ پیشانی کا کچھ حصہ اور آنکھیں نظر آتی تھیں۔ ان کے لباس کی تراش خراش اور بناوٹ بالکل صوفیوں اور درویشوں کی طرز پر تھی۔ جوانی کے دور میں وہ اکیلے سفر میں بھی اسی لباس اور بُکل میں رہتے تھے۔ بعدازاں اپنی عمر کے پچاس ساٹھ سال کے بعد چہرے کا پردہ تقریباً کم ہوگیا مگر سر پر سفید پگڑی اوراس پر سفید بڑی چادر آخری دم تک ان کے لباس کا حصہ رہا۔

میراخانوادہ:

مجھے اپنا اوراپنے خاندان کا ذکر کرتے ہوئے یہ فخر محسوس ہوتا ہے کہ ہمارا تعلق آقائے نامدار حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان سے ہے۔ مجھ سے اُوپر دس (10) پشتوں سے ہمارا تعلق نوشہرہ کے ساتھ دریائے کابل کے کنارے مشہور تاریخی گاؤں ''پیر سباک'' کے بانی حضرت سید محمود المعروف پیر سباک سے مل جاتا ہے۔ ان سے اوپر کی سینتیس (۳۷) پشتوں سے ہوکر مولائے کائنات حضرت علیہ السلام اور حضرت فاطمہ علیہ السلام سے جاملتا ہے۔ یہ خاندان بخارا سنٹرل ایشیا (موجودہ ازبکستان) سے اُچ شریف (پنجاب، بہاولپور) ہجرت کر کے آنے والے مشہور بزرگ سید جلال الدین بخاریؒ کی اولاد سے ہے جو سادات نقوی ہی کی ایک شاخ ہیں اور سید جلال الدین سرخ بخاری کی مناسبت سے بخاری سادات کہلاتے ہیں۔

پیر سباک کا خاندان ان کے پوتے پیر سید زین الدینؒ کے دور میں نوشہرہ اور مردان کے درمیان ایک وسیع وعریض جاگیر کا مالک تھا۔ بعدازاں امتدادِ زمانہ اور خاص کر سکھوں کے قبضۂ موضع پیر سباک کے بعدان کی اولاد سے۔ مختلف بزرگ موضع 'بُوٹا ضلع اٹک'۔ موضع پیران (بیت الغریب) ضلع نوشہرہ، موضع لنگرو لکھڑ

(تحصیل فتح جنگ ضلع اٹک، موضع سرائے نورنگ، موضع تاجہ زئی وخواجہ خیل ضلع لکی مروت اور موضع تبی سر(شکردرہ) ضلع میانوالی اور موضع شویکی ضلع کوہاٹ کی طرف ہجرت کر گئے)۔ خاندانی تاریخ میں بہت سے افراد کا تعلق دور دراز علاقوں (موجودہ بھارت) اور بنگلہ دیش کے مختلف اضلاع کی طرف ہجرت کا پتہ چلتا ہے۔

خاندانی شجرہ:

میرا مختصر ترین خاندانی شجرہ کچھ یوں ہے۔

سید مشتاق حسین شاہ (راقم) بن الحاج سید محمد علی شاہ بن الحاج سید میاں گل شاہ بن سید محمد امیر شاہ بن سید محمد علی شاہ بن سید میر عصمت شاہ بن سید لطف اللہ شاہ بن پیر سید زین الدینؒ بن سید فرید الدینؒ (مدفون بیت الغریب ضلع نوشہرہ نزد گاؤں ڈھیری کٹی خیل) بن سید ناصر الدین محمود المعروف پیر سباکؒ (بانی موضع پیر سباک ضلع نوشہرہ)۔ تاریخ کی کتابوں میں مذکور ہے کہ ولی زماں پیر سید ناصر الدین محمود المعروف پیر سباکؒ مغل بادشاہ جہانگیر کے عہد میں گزرے ہیں۔ مغل بادشاہ نصیر الدین جہانگیر کا پیر سباکؒ کے پاس ان کی عبادت کی جھونپڑی میں حاضر ہونا بہت سی تاریخی کتب میں موجود ہے۔ پیر سباک کے بعد خاندانی شجرہ کچھ اس طرح ہے۔

سید ناصر الدین محمود عرف پیر سباکؒ (مدفون ٹل ضلع ہنگو) بن سید ابا بکر بن سید شاہ اسماعیلؒ بن سید مہر علی بن سید مہر کلاں بن سید قلندر شاہ کریم بن میر ولی اللہ شاہ بن میر سلمان شاہ بن میر قطب الدین بن سید مہر سلطان بن سید عبداللہ بن سید محمد شاہ بن سید شاہ شمس الدین بن سید حمید الدین بن سید علی کبیر بن سید محمد طاہر (طارض) بن سید یعقوب بن سید بہاؤ الدین المقلب بہ شاہ قطبِ عالم بن سید جلال الدین مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ بن سید سلطان احمد کبیرؒ بن سید جلال الدین سرخ بخاریؒ (بانی سادات بخاری) اُچ شریف بن سید اُولیٰ بن سید جعفر بن سید محمد بن سید محمودؒ بن سید احمد بن سید عبداللہؒ بن سید علی اصغرؒ بن سید ابو عبداللہ جعفر ثانیؒ بن امام علی نقیؑ بن امام محمد تقیؑ بن امام علی موسیٰ رضاؑ بن امام موسیٰ کاظمؑ بن امام جعفرؑ صادق بن امام محمد باقرؑ بن امام علی زین العابدینؑ بن سید الشہداء امام حسینؑ بن امام علی المرتضیٰؑ اور سیدۃ النساء العالمین حضرت فاطمہؑ بنت امام الانبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

واپس اپنے خاندان کا ذکر کرتے ہوئے بتاتا چلوں کہ سکھوں کے ساتھ جہاد کے دوران ہمارے پردادا سید محمد امیر شاہ کے والد سید محمد علی شاہ پسپا ہو کر کچھ اور عزیزوں کے ہمراہ ضلع اٹک کی طرف آ گئے اور تحصیل

فتح جنگ کے موضع گکھڑ میں آباد ہوئے اور وہیں ان کی قبر کی نشاندہی ہوتی ہے جبکہ خاندان کے کچھ اور افراد موضع لنگر ضلع اٹک میں آباد ہو گئے۔ سکھوں کے خلاف جہاد کے بعد زمانۂ امن میں ہمارے بزرگوں کا آنا جانا موضع پیر سباک کے ساتھ جاری رہا مگر ہمارے دادا الحاج سید میاں گل شاہ مستقل طور پر موضع لنگر تحصیل فتح جنگ ضلع اٹک میں آباد ہو گئے اور کھیتی باڑی اور تجارت کا پیشہ اپنایا۔ خاندان سادات سے تعلق کی بنا پر لوگ ان کی بہت عزت اور احترام کرتے تھے اور انہوں نے بھی کھیتی باڑی کے علاوہ لوگوں کی مذہبی رہنمائی کا آبائی سلسلہ جاری رکھا۔

میرے دادا میاں گل شاہ (متوفی 1917ء) نے اُس زمانے میں فریضہ حج ادا کیا۔ وہ خود بھی عربی فارسی کے عالم تھے اور اپنے بیٹے (ہمارے والد بزرگوار) الحاج سید محمد علی شاہ (متوفی 1985ء) کو دینی اور دنیوی تعلیم دلوانے کا پورا اہتمام کیا تھا۔ اُن کی ایک آدھ تحریر بشمول ایک خط میرے پاس محفوظ ہے اور مذکورہ شجرہ بھی ان کے ہاتھ کا قلمی نسخہ ہمارے خاندان میں محفوظ ہے۔

ہمارے ددھیال کا تعلق موضع لنگر تحصیل فتح جنگ سے تھا اور ننھال کا تعلق موضع گکھڑ تحصیل فتح جنگ ضلع اٹک سے تھا۔ ہمارے نانا پیر سید فضل حسین مرحوم (جن کا تعلق ہمارے ہی خانوادے سے تھا) کی کوئی نرینہ اولاد نہیں تھی۔ لہٰذا ان کی وفات کے بعد گکھڑ کے معززین نے جرگہ کر کے ہمارے والد پیر سید محمد علی شاہ کو گکھڑ میں مستقل رہائش اختیار کرنے کی درخواست کی چنانچہ بڑے تین بیٹوں کی پیدائش کے بعد ہمارے والد مستقل طور پر گکھڑ آ گئے۔ اب ہماری ایک والدہ لنگر میں رہائش پذیر تھیں اور ایک گکھڑ میں۔ والد صاحب مرحوم کو دونوں گھروں کی نگرانی کرنا پڑتی، چنانچہ وہ روزانہ یا تقریباً دوسرے دن لنگر ضرور جاتے۔ ہم چار چھوٹے بہن بھائیوں (ہمشیرہ شہناز بیگم، راقم سید مشتاق حسین شاہ، سید علی حیدر شاہ اور سید سجاد حسین شاہ کی پیدائش بھی موضع گکھڑ میں ہوئی اور وہیں پر ہماری پرورش بھی ہوئی۔

میرا گاؤں (میری جنم بھومی)

موضع گکھڑ علاقہ نَلہ ضلع اٹک کا ایک قدیم اور اہم گاؤں ہے۔ (نالہ نندنا کے اِرد گرِد اور کالا چٹا پہاڑ کے ساتھ والی وادی کو نَلہ کہا جاتا ہے)۔ اس وادی میں زیادہ تر کھٹڑ، اعوان، بلوچ اور سادات برادری کے لوگ نسل در نسل آباد ہیں۔ راقم اسی گاؤں میں پیدا ہوا اور اسی گاؤں میں بچپن کے دن گزارے۔ لہٰذا۔ میرے بچپن کی یادیں اسی گاؤں سے وابستہ ہیں۔

ابتدائی تعلیم:

اپنی ابتدائی تعلیم کا تفصیلی ذکر میں نے اسی کتاب کے کسی دوسرے باب میں کیا ہے۔ میں نے بتایا ہے کہ ابتدائی تعلیم کی میری پہلی استاد میری والدہ مرحومہ (سیدہ مدینہ خانم) ہی تھیں جنہوں نے کچی کا قاعدہ (ا ب ج) مجھے سکول داخل ہونے سے پہلے گھر پر ہی پڑھا دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ سکول میں با قاعدہ داخلے کے چھ روز بعد ہی مجھے کچی جماعت سے پکی (نرسری، پریپ سے کلاس ون) میں ترقی دے دی گئی۔ گورنمنٹ پرائمری سکول گکھڑ کے اساتذہ کا تفصیلی ذکر بھی میں کسی دوسرے باب میں کر چکا ہوں ہاں پرائمری سکول کی پڑھائی، پڑھائی کا سامان اور طریقہ کار کا مختصر ذکر یہاں کروں گا۔

میری غیر رسمی (نان فارمل) تعلیم تو گھر میں ہی شروع ہو چکی تھی۔ ناظرہ قرآن مجید کی تعلیم کے لیے عربی حروف تہجی کا ابتدائی قاعدہ جس پر بغدادی قاعدہ لکھا ہوتا تھا اور سکول کی کچی جماعت کی کتاب (اُردو کے حروف تہجی کا قاعدہ) تقریباً ایک جیسے ہونے کی وجہ سے دونوں آسانی سے سیکھ گیا۔ تاہم اس وقت دونوں زبانوں کے حروف تہجی کا رسم الخط مختلف ہونے (قرآنی قاعدہ نسخ اور اردو قاعدہ نستعلیق میں ہونے) کی وجہ سے تھوڑی سی مشکل پیش آئی) مگر فائدہ یہ ہوا کہ خطِ نسخ اور خطِ نستعلیق سے ابتدائی دور میں ہی واقفیت ہو گئی۔

سکول جا کر پہلی مرتبہ لکھائی کا آغاز ہوا تو والدہ مرحومہ نے سکول کے لیے اردو قاعدہ کے ساتھ نڑی سے بنی ہوئی (قلم اور سیاہی کی دوات) بمعہ تختی تیار کر کے ایک کپڑے کے ٹکڑے میں باندھ دی۔ تختی عموماً کپڑے کے ٹکڑے سے باہر ہاتھ میں ہوتی تھی یا کتاب اور قلم دوات والی پوٹلی کو تختی کے اوپر رکھ کر اُسے سر پر رکھ لیتے تھے۔

پکی پہلی میں پورا سال لگانے کے بعد ہم سکول کے ماحول سے مانوس ہونے لگےاور پھر اگلی کلاس میں آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ "اپنی مدد آپ" کے اصول (اپنی قلم کتاب خود سنبھالنا تختی دھونا اور سُکھانا اور اپنی بڑی بہن اور محلے کے دیگر بچوں کے ہمراہ گھر سے سکول اور سکول سے گھر آنا جانا) خود ہی سیکھ گئے اور اپنے گھر کے بڑوں کو اس ذمہ داری سے سبکدوش کر دیا۔

دوسری جماعت میں بستے میں سلیٹ کا بھی اضافہ ہو گیا۔ سلیٹ ابتدا میں مٹی کی ایک پلیٹ کو کہتے تھے جس کو پکا کر اس کو سیاہ رنگ کر دیا جاتا تھا اور اس پر سفید رنگ کی "سلیٹی" (مٹی یا کھڑیا مٹی سے بنی ہوئی (2 انچ کی سلیٹی) سے لکھائی کرتے تھے۔ بعد میں ٹین یا سٹیل کی پلیٹ کو سیاہ رنگ کر کے سلیٹ بنائی گئی جس پر ہم ریاضی (حساب) کے سوالات حل کرتے تھے۔ یہ سلیٹ اس لحاظ سے مفید تھی کہ ایک سوال حل کرنے کے بعد اُس کو فوم کے پانی یا تھوک کے ذریعے مٹا دیا جاتا یعنی سلیٹ اور سلیٹی آج کے رف کاغذ یا رف کاپی کا متبادل سمجھ لیں۔

سکول اور گھر سے باہر

سکول میں ابتدائی تعلیم کے ساتھ ساتھ ہمارے دیگر مشاغل بھی تھے جو بچپن کی زندگی کا ہی حصہ تھے۔ یہ سب مشاغل یعنی کھیل کود، گھر کے کام کاج، ہم عمروں سے دوستیاں، لڑائی جھگڑے، کھیتوں میں کام کاج ساتھ ساتھ چلتے تھے۔اس لئے ان کا ذکر بھی ایک دوسرے کے ساتھ ہی ہوگا۔

کھیل کود:

ے
کھیل بچپن کے لڑکپن کے بہت دِلکش تھے
اُس زمانے میں کہاں بارِ دِگر جا ئیں گے

ناصر علی سید

اگر کھیل کود کا ذکر کریں تو ان کا ذکر بھی پڑھائی کے ذکر کے ساتھ ہی ہوگا۔ ویسے تو کھیل کھیل میں تعلیم کا تصور اس وقت نہیں تھا مگر سکول کے اندر بھی فارغ پیریڈ میں یا بریک کے دوران ہم ہاتھوں کے کرتب سے آپس میں ایک کھیل کھیل لیتے۔ سلیٹ پر چند خانے بنا کر ہم شطرنج کے کھیل کی ابتدائی شکل سے محظوظ ہوتے رہتے۔ اس کے علاوہ سکول سے باہر نکل کر اور بعض اوقات سکول کے اندر سلیٹ اور تختیاں لڑانے کا خطرناک کھیل بھی کھیل لیتے۔

سکول میں ابتدائی ادوار میں ہوم ورک کا تکلیف دہ تصور نہ ہونے کے برابر تھا۔لہٰذا سکول سے گھر آ کر شام کے اوقات میں آج کل کے بچوں کے معمولات کے برعکس ہم اپنا زیادہ تر وقت اپنا مقبول ترین کھیل " بنٹے " یا کانچ کی گولیاں کھیلنے میں گزار دیتے۔ مقامی دکانوں سے ایک یا دو پیسے میں کانچ کی ایک گولی مل جاتی (اُس وقت ایک روپے میں سولہ آنے اور ایک آنے میں چار پیسے ہوتے تھے) اس گولی کو ہم اس وقت تک کھیل میں استعمال کرتے جب تک یہ ایک دوسرے سے ٹکرا ٹکرا کر دو ٹکڑے نہیں ہوجاتے یا چوٹیں کھا کھا کر بلکل کھر درے نہیں ہو جاتے۔ ''کانچے'' کھیلنے کے مختلف طریقے ہوتے تھے مگر مقبول ترین طریقہ ہموار مٹی کے میدان میں ایک چھوٹا سا گڑھا بنا کر اس میں کانچ کی گولی پیلنا ہوتا تھا۔اس طرح باہر رہ جانے والی گولیوں (کانچوں) کو اپنی انگلیوں کے درمیان رکھ کر اسے اپنی درمیان والی انگلی اور دوسرے ہاتھ کے انگوٹھے میں پکڑ

کرا پنے مد مقابل کھیلنے والے کی گولیوں کا شکار کرنا ہوتا تھا۔ مد مقابل کی جو گولی دوسری گولی کا نشانہ بن جاتی وہ جیتنے والے کی جیب میں آجاتی اور یہ جیتنے والے کی خوش قسمتی اور مہارت پر مشتمل ہوتا کہ وہ کتنے " بنٹے " یا کنچے جیت کر اپنی جیب بھرتا۔ کنچوں کے کھیل کے سلسلے میں اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ ''سرکاری طور پر'' یعنی سکول انتظامیہ کی طرف سے کنچے کھیلنا غیر قانونی اور ممنوعہ اعمال میں شامل تھا۔ اس لئے میرے گاؤں کے مقامی استاد۔ منشی وارث خان مرحوم (جو آج تک میرے آئیڈیل استاد ہیں)، ہمارے گھر سے دور دوسرے محلے میں رہائش پذیر تھے، کبھی کبھار پورے گاؤں کا چکر لگاتے اور جہاں جہاں بھی یہ ممنوعہ کھیل ہو رہا ہوتا وہ اپنی آمد سے پورے کھیل کو تلپٹ کر دیتے اور کھیل میں استعمال ہونے والا سامان'' کانچے'' بھی بحق سرکار ضبط کر کے اپنی جیب میں ڈال لیتے اور اس بات کا پتہ نہ چلتا کہ ضبط شدہ مال استاد محترم اپنے بچوں کو 'توشہ خانہ' سے دلوا دیتے یا ان کو سرکاری نگرانی میں ضائع کروا دیتے تاہم درجنوں ضبط شدہ'' کانچوں'' کے ریکارڈ کا تھانہ پولیس کے ضبط شدہ اسلحے کی طرح کچھ پتہ نہ چلتا۔ تاہم اس کھیل کے شرکاء اگلے روز اپنی استطاعت کے مطابق ایک دونئے کانچے خرید کر کھیل کا دوبارہ آغاز کرتے، حتٰی کہ استاد محترم منشی وارث خان کے اگلے چھاپے تک کھیل کا دورانیہ پوری آب و تاب کے ساتھ جاری رہتا۔

کانچوں کے کھیل کے علاوہ شروع میں اپنی ہم عمر لڑکیوں کے "چنیدک" کے کھیل میں کبھی کبھی شامل ہو جانا بھی کوئی معیوب بات نہیں سمجھی جاتی تھی۔

☆ اسی طرح کبھی کبھی دائرہ بنا کر کپڑے سے بنے ہوئے " کوڑے " کے ساتھ کھیلا جانے والا دلچسپ کھیل بھی کھیل لیتے۔ اس کھیل میں اپنی پیٹھ کے پیچھے رکھی ہوئی چیز سے بے خبر رہ جانے والے کو پیٹھ پر ایک دو کوڑے کی سزا بھگتنا پڑتی۔

☆ پانچویں اور چھٹی جماعت میں پہنچ کر ہم جسمانی طور پر اس قابل ہو گئے کہ گلی ڈنڈے والا کھیل کھیل سکیں۔ گُلی ڈنڈے کا کھیل بھی کرکٹ کی ایک ابتدائی شکل تھی جس کا ابتدائی اور مرکزی خیال ہم سے ہی چرا کر انگریز لوگ اس کو ترقی دے کر ایک بین الاقوامی کھیل کی شکل دینے میں کامیاب ہوئے۔ کاش کوئی محقق اور ماہر گلی ڈنڈا اس پر تحقیق کر کے ہمارے اس کردار اور اس آبائی کھیل کی اہمیت کو اُجاگر کر کے

اسے تاریخ میں محفوظ کر سکے کہ تین فٹ کے ڈنڈے اور آٹھ انچ کی گُلی کے اس کھیل نے ترقی کر کے کیسے کرکٹ کی شکل اختیار کر لی حالانکہ کبھی کبھی گلی ہوا میں دور جانے کی بجائے پیٹ یا آنکھ کو بھی اپنا نشانہ بنا لیتی تھی مگر ان خطرات کے باوجود اس کھیل کی اہمیت اپنی جگہ آج بھی تاریخ میں محفوظ ہے۔

☆ بچپن کا ایک اور کھیل جس کو بڑے پیمانے پر بڑے بھی کھیلتے تھے، وہ کبڈی کا کھیل تھا۔ اُس زمانے میں کبڈی کی دو قسمیں تھیں۔ بڑی کبڈی اور چھوٹی کبڈی۔ بڑی کبڈی میں ایک زور آور اور تیز رفتار دوڑ لگانے والا پہلوان نما آدمی میدان میں نکل کر دوڑ لگاتا اور اس کے پیچھے دوسری پارٹی کے دو آدمی اس کا پیچھا کر کے اس کو پکڑنے کی کوشش کرتے اور فلائینگ کک اور فلائینگ قینچی کا ماہرانہ استعمال کر کے آگے دوڑنے والے رَنر کو پکڑنے کی کوشش کرتے اور اپنی ماہرانہ چالوں سے تماشائیوں سے داد وصول کرتے۔ بڑی کبڈی میں اکثر دو دیہاتوں کے درمیاں میچ بھی منعقد ہو جاتے اور انہیں دیکھنے کے لئے دونوں گاؤں (بلکہ ارد گرد کے دیہاتوں سے بھی) تماشائیوں کا ایک جم غفیر جمع ہو جاتا اور ایک میلے کا سماں بندھ جاتا۔

چھوٹی کبڈی:

کبڈی کی یہ قسم آج کھیلوں کی ایک اہم قسم شمار ہوتی ہے اور یہ باقاعدہ قوانین وضوابط کے تحت نیشنل اور انٹرنیشنل ایونٹ کے طور پر کھیلی جاتی ہے۔ اس کھیل میں پانچ پانچ، چھ چھ کھلاڑیوں کی حد بندی کر کے اپنی اپنی اطراف میں کھڑے ہو جاتے۔ ایک کھلاڑی نکلتا اور دوسری ٹیم کی حد میں جا کر ان کو چیلنج کرتا، اس طرف کی پوری ٹیم اس کو پکڑنے کے لیے اس پر جھپٹتی، اگر وہ ان میں سے کسی کو چُھو کر یا ان کی پکڑ سے آزاد ہو کر واپس اپنی حد میں آجاتا تو اس کی ٹیم کی جیت ہوتی اور اگر وہ پکڑا جاتا تو اس کا کردار اپنی ٹیم کیلئے ختم ہو جاتا۔

کبڈی کا یہ کھیل بھی جب بڑوں میں کیا جاتا تو وہ ایک بڑا ایونٹ event (واقع) بن جاتا۔ کبڈی کی یہ قسم آج اب اصول وضوابط کے تحت ایک باقاعدہ کھیل کی شکل اختیار کر چکی ہے اور ساتھ ہی بین الاقوامی کھیل بھی۔

دیگر مقامی کھیلوں میں اپنی استطاعت کے مطابق پتنگیں اڑانا، لوہے یا ربڑ کا ایک گول پہیہ سریے

کی ایک سلاخ کے ساتھ دوڑانا بھی ایک دلچسپ کھیل تھا۔ یہ گول پہیہ جو سریے کی سلاخ کو گول کر کے بنایا جاتا، اسے ایک دوسرے سریے کی سلاخ سے جو آگے سے گول ہوتی تھی اوراس کی مدد سے گول پہیے کو ہموار اور ناہموار گلیوں میں مہارت سے چلایا جاتا۔ اس کھیل کے لیے مقابلے تو شاید ہی منعقد ہوتے مگر گھر اور گلیوں میں یہ پہیہ نماز چیز دوڑا کر خود ہی لطف اندوز ہوتے۔

آنکھ مچولی:

آٹھ دس سال کی عمر میں عموماً چاندنی راتوں میں اپنے ہم جولیوں کے ساتھ (حسبِ اجازت والدین) آنکھ مچولی کے مختلف طریقوں کے کھیلوں سے لطف اندوز ہوتے۔ اور یہ کھیل بعض اوقات رات گئے تک جاری رہتا مگر گھر والوں کی ڈانٹ اور اگلے دن اجازت نہ ملنے کے ڈر سے چاند کی روشنی ختم ہونے سے پہلے ہی یہ کھیل ختم کر کے بادلِ نخواستہ واپس آنا پڑتا۔

کھِلونے

گھگو گھوڑے:

کھیلوں کے ساتھ کِھلونے لازم وملزوم ہیں۔ عموماً گرمیوں کے موسم میں اچانک چند خانہ بدوش گاؤں میں آ کر کسی بھی خالی کھیت میں جھگیاں لگا لیتے۔ انہیں خیمہ زن ہوتے ہوئے دیکھ کر ہمارے اندر خوشی کی لہر دوڑ جاتی کیونکہ اگلے روز یہی لوگ ہمارے لئے کِھلونوں کی کئی قسمیں لے کر پہنچ جاتے۔ ان کی عورتیں مٹی کے بنے ہوئے گھگو گھوڑے لے کر ہمارے گھروں میں پہنچ جاتیں اور پیسہ، دو پیسے یا مٹھی بھر گندم یا مکئی کے آٹے یا دانوں کے عوض ایک دو کھلونے دے دیتے۔ گھگو اس موسیقی بجانے والے مٹی کے آلے کو کہتے تھے جسے منہ سے لگا کر مختلف آوازیں نکالتے اور اسے ہم گلیوں اور گھر کے صحن میں بجا کر محظوظ ہوتے رہتے۔

اسی طرح مٹی سے بنے ہوئے کتے، گھوڑے اور دیگر جانوروں کے مجسمے (جو عجائب گھروں میں پائے جانے والے جانوروں کے مجسمے کی طرح ہوتے تھے) خرید کر ہم اس وقت تک ان سے دل بہلاتے رہتے جب تک وہ گر کر ٹوٹ نہیں جاتے تھے۔ اس اسی طرح کانے (سرکنڈے) کے آگے لگی ہوئی کاغذ کی بنی ہوئی پھرکیاں جو تیز چلنے اور دوڑنے سے ہوا کی مخالف سمت میں چلنے سے آج کے پیڈسٹل پنکھوں کی طرح

تیزی سے گھومتی تھیں اور ہم انہیں دوڑ کر یا تیز چل کر گھمانے سے لطف اندوز ہوتے۔

بانسری:

بہت چھوٹی عمر میں ہمارے بڑے بھائی فتح جنگ (سائیں حاضر بابا کے میلے) سے ہمارے لیے اس طرح کے کھِلونے لاتے جس میں سادہ نڑی سے بنی ہوئی بانسری کی قسم کو جسے ہم "نلہ" کہتے تھے اور ہماری بہن کے لیے گڑیا لے کر آتے تھے۔ ہم اس "نلہ" کو دیکھ کر باغ باغ ہو جاتے کیونکہ اگلے چند روز ہم اس کے شور سے بڑوں کے کان کھا سکتے تھے۔ مڈل سکول کی عمر میں ہماری نظر اور تجربے میں مزید کھِلونے بھی آئے مگر مہنگے کھلونوں کی عیاشی ہمارے نصیب میں نہیں تھی۔ (اس بارے میں ایک الم انگیز کہانی اپنے پوتے کے حوالے سے اِسی کتاب میں پیش کر چکا ہوں)

ہمارا گاؤں:

اس سے پہلے بتا چکا ہوں کہ ہمارے آباواجداد جب پیر سباک ضلع نوشہرہ سے ہجرت کر کے ضلع اٹک کے موضع لنگر و گکھڑ میں آباد ہوئے تو انہوں نے کھیتی باڑی اور چھوٹی موٹی تجارت کو اپنی گزراوقات کا ذریعہ بنایا۔ انہی بزرگوں کی زمینوں پر ہمارے والد مرحوم اور دیگر بزرگوں نے کھیتی باڑی اور زراعت کا پیشہ اپنایا۔

خاندانی تاریخ میں مذکور ہے کہ جنگ پیر سباک اور سکھوں کی فتوحات کے بعد دوسروں کی طرح ہمارے ایک جَد (ہمارے دادا کے دادا سید محمد علی شاہ (دوئم) ہجرت کر کے گکھڑ پہنچے (غالباً اس سے پہلے ضلع اٹک کے مختلف دیہات میں ہمارے سادات کے لوگ پہنچے ہوئے تھے) ان کی قبر گکھڑ کے قبرستان میں موجود ہے۔ ان کے بعد ہمارے خاندانی بزرگوں نے موضع لنگر کو اپنی رہائش کے لئے منتخب کیا۔

موضع گکھڑ:

گکھڑ راجپوتوں کی ایک قوم ہے جو سطح مرتفع پوٹھوار یعنی جہلم چکوال، راولپنڈی اور اٹک کے علاقوں میں آباد ہے مگر یہ گاؤں گکھڑ خان نامی ایک شخص کے نام پر صدیوں پہلے آباد ہوا۔ گکھڑ گاؤں میں زیادہ تر کھٹڑ اعوان، بلوچ اور سادات اقوام آباد ہیں۔ یہ گاؤں تحصیل فتح جنگ کے جنوب میں کالا چٹا پہاڑ کی بڑی چوٹیوں کے جنوب کی پہاڑیوں کے وسیع سلسلہ میں ایک وادی میں آباد ہے۔ گاؤں کے شمال میں کالا چٹا کا طویل پہاڑی سلسلہ جبکہ شمال

میں ایک کلومیٹر سے کم فاصلے پر علاقہ نلہ کا مشہور نالا نندنا بہہ رہا ہے۔

تو اب میں کہ سکتا ہوں کہ موضع گگھڑ کی تاریخ، تہذیب، معشیت و معاشرت میں کالا چٹا پہاڑ اور نالہ نندنا بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ اپنی جنم بھومی کے بارے میں میرے جذبات..................

جس میں کچھ قبریں ہوں، کچھ یادیں ہوں، کچھ چہرے ہوں
کتنا دشوار ہے ، اُس شہر سے ہجرت کرنا

کالا چٹا پہاڑ:

کالا چٹا کا مطلب مقامی زبان میں سیاہ و سفید ہے وجہ یہ ہے کہ اس پہاڑ میں پائے جانے والے پتھر کا بنیادی رنگ سیاہ ہے مگر اس کو جب بھٹی میں جلا کر جب چونا بنتا ہے تو اس کا رنگ بالکل سفید ہوتا ہے۔ اپنے اندر سرسبز وادیوں، جنگلات سے بھری چوٹیوں اور چشموں اور چھوٹے بڑے نالوں پر مبنی کالا چٹا پہاڑ کا سلسلہ مشرق میں راولپنڈی سے مغرب کی طرف سنگ جانی کے پاس سے شروع ہو کر مغرب میں اٹک شہر کے شمالی مضافات تک پہنچ جاتا ہے۔

عِلم جنگلات کی اصطلاح میں کالا چٹا پہاڑ کو ''Subtropical broad leaved ever green forest'' کہا جاتا ہے۔ انہی جنگلات پر مشتمل اس پہاڑ میں کُہو (قدرتی زیتون) پھلا ہی اور سینکڑوں اقسام کی جھاڑیاں پائی جاتی ہیں۔ جھاڑیوں کے علاوہ یہاں قدرتی گھاس کے وسیع ذخائر اور جڑی بوٹیوں کی بے شمار اقسام پائی جاتی ہیں۔ گھاس اور درختوں کے پتے مقامی جانوروں اور مویشیوں کے لئے خوراک کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ جبکہ یہاں کی جڑی بوٹیاں بے شمار قسم کی ادویات کی تیاری میں استعمال ہوتی ہیں۔ کالا چٹا پہاڑ اپنی چوٹیوں، وادیوں، چشموں اور صاف پانی کے نالوں اور جھرنوں کہ وجہ سے سیاحوں کے لئے کسی جنت سے کم نہیں۔

اسی پہاڑ کے وسائل کی وجہ سے یہاں کی انسانی آبادی صدیوں سے زندگی کے مزے لوٹتی رہی اور آج بھی ہزاروں لاکھوں انسانوں کی زندگی کا دارومدار اسی پہاڑ اور اس کے جنگلات پر ہے۔ راقم کا بچپن سے ہی کالا چٹا سے واسطہ اس طرح رہا کہ اس پہاڑ کی چھوٹی چھوٹی شاخیں یعنی پہاڑیاں ہمارے ہر دیہات تک پھیلی ہوئی ہیں۔





جنگلی پھل چونگیں اور گُرگُرے (گُنگیر)

ہمارے گاؤں کے تمام گھروں کی تعمیر میں انہی پہاڑیوں کے پتھر استعمال ہوئے ہیں اور ہم نے بچپن میں گھروں کی چھتوں پر اسی کالا چٹا کے جنگلات کی لکڑیوں سے بنے ہوئے چھت دیکھے۔ بچپن سے نکل کر لڑکپن کی حدود میں آئے تو اپنے گھر سے دو، تین اور چار کلو میٹر دُور تک جا کر اپنے خاندان کی روز مرہ ضروریات کے لئے ایندھن لانا بھی ہماری ذمہ داریوں میں شامل تھا۔ ہر اتوار کو چھٹی کے دن اپنے بڑے بھائیوں کی سرکردگی میں گروپ کی شکل میں جا کر خشک اور سبز ایندھن کی لکڑیاں چن کر ''گڈَوں'' کی شکل میں اپنے سر پر رکھ کر گھر کے لئے لانا ہمارا معمول اور فریضہ ہوتا تھا۔ اور یہ ایک ایسا فریضہ تھا جو گاؤں کے تقریباً ہر لڑکے کو انجام دینا ہوتا تھا۔ کیونکہ روٹی اور دیگر خوراک اُس وقت بھی پکا کر کھائی جاتی تھی اور اس کے لئے بنیادی ضرورت خشک لکڑی ہی تھی۔ مٹی کے تیل اور گیس کے تو اس وقت خواب بھی نہیں دیکھے جا سکتے تھے۔



جنگلی جانور سیہہ

کالا چٹا پہاڑ کا ذکر ہو اور اس کے اندر بسنے والے خوبصورت جانوروں، مویشوں اور چرند و پرند کا ذکر نہ ہو تو یہ زیادتی کے مترادف ہوگا۔ پالتو جانوروں میں بھینس، گائے، بکری، بھیڑ، گھوڑا اور گدھا قابلِ ذکر ہیں جبکہ

جنگلی جانوروں میں شیر، بھیڑیا، گیدڑ، لومڑی، سیہہ ،خرگوش اور چند دیگر چوپائے قابل ذکر ہیں۔ شیر اور اس کے شکار کا ذکر تو ہم نے اپنے بچپن میں کئی بار سنا اور ان بزرگ شخصیات کو بچپن میں دیکھنے کی سعادت بھی حاصل کی جنہوں نے شیر کا شکار بندوق، جال یا کڑکی کے ذریعے کیا تھا۔ تاہم بعد ازاں شیر اس جنگل سے معدوم ہو گیا اور شیر کا شکار بھی قصہ پارینہ بن گیا البتہ بھیڑیا، گیدڑ لومڑی اور دیگر جنگلی جانور گاہ بگاہ کالا چٹا کے جنگل میں ہم خود بھی دیکھ لیتے یا کسی سے ان کا ذکر سن لیتے۔ کالا چٹا پہاڑ کے جنگلات اور دیہات میں خوبصورت پالتو اور جنگلی پرندے بھی بکثرت پائے جاتے ہیں۔

پالتو پرندوں میں مرغ اور بطخ گھروں میں بکثرت پائے جاتے۔ جنگلی اور آزاد پرندوں میں گھریلو کوا، چیل، ہُد ہُد، بٹیر، باز، فاختہ، بگ، گھریلو چڑیاں، گُشرو، مَینا، طوطے اور کئی قسم کے موسمی پرندے مرغابیاں اور کھَویاں (فاختہ کی ایک قسم) جو سائبیریا اور دیگر علاقوں سے ہجرت کر کے آتے اور موسم کے ختم ہوتے ہی غائب ہو جاتے۔ گھریلو مرغیوں اور بطخوں کی کئی اقسام کے علاوہ جنگلی پرندے از قسم بھورا تیتر، طوطے، مینا، گُشرو (جنگلی بلبل) اور دیگر کئی قسم کے خوبصورت پرندے گھر میں پالنا ہمارا مشغلہ ہوتا تھا۔



بھورے تیتر کے ایک دن کے، جسامت میں بہت ہی چھوٹے بچے ایک دو دن کے تیتر بچے صرف دیمک کھاتے تھے اور ہمیں ان کو پالنے کے لئے کئی دنوں تک کھیتوں سے دیمک ڈھونڈھ کر کھلانی پڑتی تھی۔ چند مہینوں کی محنت کے بعد تیتر کے وہ بچے ایسی آوازیں نکالنے لگتے جنہیں سن کر ہماری محنت ٹھکانے لگتی محسوس ہوتی۔ پالتو جانور گائے بکریاں وغیرہ کے ذکر میں اگر میں اپنے گھر کی گوری گائے کا ذکر نہ کروں تو زیادتی ہوگی۔ اس گائے کے ساتھ چند اور گائیں اور بکریاں اور ان کے بچے بھی ہم نے گھر کے ایک حصے میں رکھے ہوئے تھے۔

ان جانوروں کے چرانے کا طریقہ بھی قابل ذکر ہے۔ ہمارے گھر کی دیوار کے بالکل ساتھ والے گھر کے لوگ یعنی ہمارے ہمسائے بابا جلال اور اس کے گھر والے والے ان جانوروں کی خوراک اور ان کو جنگل لے جانے اور واپس لانے کے ذمہ وار تھے۔ صبح سویرے ''ماسی کھاموں'' (بابا جلال کی بیوی خدا جانے

اس کا پورا نام کیا ہوگا) اپنے گھر سے ہر روز آواز نکالتی ’ گایاں، بکریاں کھولو‘ تو ہم تمام جانوروں کے گلے کی رسیاں کھول دیتے، جانور بھی ماسی کھاموں کی آواز سن کر خود ہی کھڑے ہو جاتے اور گلے کی رسیوں سے آزاد ہو کر ہماری لمبے، گول اور خوبصورت سینگوں والی گوری گائے کی سرکردگی میں گھر سے نکل کر ان کے جانوروں کے ساتھ شامل ہو جاتے اور جانوروں کے اس مشترکہ ریوڑ کی سرکردگی دوبارہ ہماری گوری گائے کے حوالے ہو جاتی اور اسی طرح اس ’’کاروان جانوراں‘‘ کی واپسی بھی بڑے اور خوبصورت سینگوں والی اس گوری گائے کی سرکردگی میں ہوتی۔ جانوروں کو گھر میں ’’کُھر لی‘‘ پر بھی خوراک دینی پڑتی تھی اور وا بھوسے کا ’’گُتاوہ‘‘ یا جوار اور جنگلی گھاس اور سرسبز بوٹیوں کی شکل میں دینی پڑتی۔ کہو (جنگلی زیتون) کے درخت کی سرسبز اور تازہ کونپلوں والی شاخیں لا کر ان کو ’’ٹوکے‘‘ کے ذریعے ہاتھ سے یا ٹوکے والی مشین سے کاٹ کر کھلانا ہمارے فرائض



مدھانی اور لسی

میں شامل تھا اور اس کے بدلے میں ہمیں گوری گائے کا میٹھا اور لذیذ دودھ میسر آتا جسے بعد ازاں ہماری والدہ ’’بے جی‘‘ دہی بنا کر مدھانی کے ذریعے ’’رِڑھک‘‘ کر نہ صرف ہمارے لئے لسی اور مکھن تیار کرتیں بلکہ محلے کے ان گھروں کے لئے لسی کی دستیابی یقینی بناتیں جن کے گھر میں گائے یا بھینس نہ ہوتی اور جنہیں مکئی یا باجرے کی روٹی آسانی سے چبانے کے لئے لسی کی ضرورت ہوتی تھی۔

اور یہ انہی دنوں کی بات ہے جب راقم آٹھویں جماعت کے امتحان سے فارغ ہو کر اپنے گھر کے جانوروں خاص کر دودھ دینے والی گایوں کے لئے جنگل سے (کوّہے) کی باریک نازک شاخیں جنگل سے کاٹ کر اپنے کاندھوں پر لاتا اور بسا اوقات انہیں ’’ٹوکے‘‘ کی مدد سے باریک ٹکڑوں میں کاٹ کر جانوروں کے لئے چارہ بنانے کا فریضہ بھی سرانجام دیتا تھا۔

کالا چٹا پہاڑ کا تمام اہم رقبہ اور جنگل اس وقت ایک قومی ’’حساس ادارے‘‘ کے تصرف میں ہے۔ ’’حساس ادارے‘‘ کے تصرف میں جانیکے بعد اگرچہ پہاڑ کے علاقے سے گزرنے اور یہاں آنے جانے

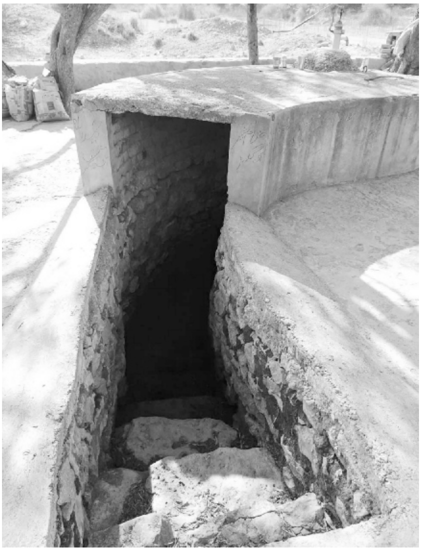
پر کافی پابندیاں عائد ہو چکی ہیں مگر قومی مقاصد کے حصول کے علاوہ خود جنگلات اور یہاں کے جانوروں اور درختوں کی حفاظت کا مکمل اہتمام ہو گیا ہے۔

جنگل میں درختوں کی بے دردی سے کٹائی کی وجہ سے جو پہاڑ ٹنڈ منڈ نظر آنے لگے تھے وہ اب دوبارہ ہرے بھرے جنگلوں کا منظر پیش کر رہے ہیں۔اب نہ صرف جنگلات کے درخت دوبارہ اُگ چکے ہیں بلکہ ان میں رہنے والے کئی جانور اور پرندے جو ہمارے بچپن میں ہی معدوم ہو چکے تھے اب دوبارہ بڑی مقدار میں پائے جاتے ہیں۔کالے اور بھورے تیتر کی جو آوازیں کان سننے کے لیے ترس چکے تھے وہ اب سڑک اور راستوں کے اردگرد بڑی مقدار میں سنائی دیتی ہیں اور اس علاقے میں شکار پر پابندی کی وجہ سے جنگلی حیات نہ صرف محفوظ ہو چکی ہے بلکہ ان کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہو چکا ہے۔اب کالا چٹا کا جنگل اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ صدیوں سے قائم و دائم ہے۔

آپ کو بتاتا چلوں کہ بچپن کے بعد کالج لائف میں بھی کالا چٹا کے ساتھ رابطہ بدستور رہا۔ وہ اس طرح کہ اٹک کالج جانے کے لیے اپنے گاؤں سے چار کلومیٹر دور بس اڈے پنا والی بن (تالاب) تک جاتے ہوئے اسی جنگل کے کچے رستے سے پیدل چل کر جانا پڑتا تھا۔بس کا اڈا بذات خود پہاڑیوں کے سنگم میں واقع تھا جہاں بیٹھ کر ہم فتح جنگ سے کیمبل پور جانے والی بس کا انتظار کرتے۔اس بس کی سواری بھی ہمیں اتوار کی چھٹی گزارنے کے لئے ہفتے میں ایک بار آتے اور جاتے وقت نصیب ہوتی تھی۔ بقیہ چار کلومیٹر کا گھر تک پہنچنے کا سفر ہم کچے راستے یا کچی سڑک سے عبور کرتے۔

باولی (کنواں)

اس تین چار کلومیٹر والے کچے راستے کے بالکل وسط میں ایک کنویں کا ذکر بھی ضروری ہے۔ یہ کنواں گاؤں اور تالاب والے اڈے کے بالکل وسط میں موجود تھا۔کنویں کی بناوٹ گاؤں کے دیگر کنوؤں سے بالکل مختلف تھی۔ یہ کنواں شیر شاہ سوری بادشاہ کے دور کی تعمیر کردہ "باؤلی" کی طرز پر بنایا گیا تھا جس پر ڈول اور رسی رکھنے کی بجائے اس میں بنائی گئی سیڑھیوں کے ذریعے اُتر کر پانی تک پہنچا جا سکتا تھا۔اس طرح کوئی جانور یا چرند پرندہ تو اس پانی تک نہیں پہنچ سکتے مگر اس راہ سے پیدل چل کر گزرنے والے مسافر اس



باولی (کنواں)

کنویں کے ٹھنڈے پانی سے اپنی پیاس ضرور بجھاتے اور اس کے کے بنانے والے اللہ کے نیک بندے کو دعاؤں سے نوازتے۔

نوے (90) کی دہائی میں جب میرے بھائی سید علی حیدر شاہ مرحوم آرمی سے ریٹائر ہو کر گھر آئے تو انہوں نے اس کنویں کو نئے سرے سے تعمیر کر کے اس پر چھت ڈال کر ایک دستی نلکہ نصب کرنے کا ارادہ ظاہر کیا جسے میرے مشورے سے انہوں نے پایہ تکمیل تک پہنچا دیا۔ آج یہ کنواں تو موجود ہے مگر کچے راستے کے پکی سڑک میں تبدیل ہو جانے اور تیز رفتار ٹریفک کے جاری ہونے سے اس کنویں کی افادیت ختم ہو چکی ہے اور دیگر آثار کی طرح یہ کنواں بھی اب آثار قدیمہ کا مرتبہ حاصل کر چکا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس طرز کا کوئی اور کنواں یعنی باولی ہمارے اس گاوں میں تو کیا پورے علاقے میں کہیں نہیں ہے۔

نالہ نندنا:

جیسا کہ میں نے آغاز میں بتایا کہ میرے گاؤں کے قدرتی مناظر اور قدرتی بناوٹ میں کالا چٹا پہاڑ اور نالہ نندنا بنیادی حیثیت رکھتے تھے اور انہی دو قدرتی مناظر پر ہمارے گاؤں کی زندگی کا انحصار تھا۔ کالا چٹا پہاڑ کا تو ذکر ہو چلا، نالہ نندنا بھی میری زندگی کے ابتدائی ایام میں اتنا ہی اہم رہا، بلکہ میں اگر یہ کہوں کہ میں پرائمری تعلیم کے بعد اتوار کے علاوہ اس نالے سے روزانہ کی ملاقات میری زندگی کا معمول تھی کیوں کہ اس نالے کو عبور کر کے ہی میں اپنے ہائی اسکول باہتر جایا کرتا تھا۔

نالہ نندنا خطہ پوٹھوار یا ضلع اٹک کا صاف، صحت بخش اور ٹھنڈے پانی کا وہ نالہ ہے جو اپنے اردگرد کی انسانی آبادی اور جانداروں کی زندگیوں میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ نالہ نندنا اپنے وجود

کے ساتھ انسانی بستیوں کو اپنے اردگرد بسانے کا ذریعہ بنا۔ یوں تو سطح مرتفع پوٹھوہار اور ان میں کئی چھوٹے بڑے دریا اور نالے بہتے ہیں اور ان کا پانی صاف ستھرا، آلودگی سے پاک، حیات بخش پانی ہیں مگر ضلع اٹک میں بہنے والے اس نالے کی جدا ہی کیفیت ہے اس کا پانی اس وقت بھی صحت افزا اور حیات بخش تھا جب اس کے اردگرد کی آبادی سو فیصد انحصار اس کے پانی پر تھا اور آج پینے اور گھریلو استعمال کیلئے کنووں، نلکوں اور پانی کی موٹروں اور ٹیوب ویلوں کے آجانے کے باوجود اور موجودہ دور کی آلودگیوں خاص کر آبی آلودگیوں کے باوجود اس نالے کا پانی آج بھی اسی طرح صاف ستھرا ہے جس طرح کہ آج سے پچاس سال پہلے ہوا کرتا تھا۔ تاہم بہتر ہے کہ مقامی حکومتی ادارے نالہ نندنا کے پانی کو آلودگی سے بچانے اور آبی حیات کیلئے اسے محفوظ اور حیات بخش بنانے کے لیے مناسب اقدام کریں۔ نالہ نندنا سے بچپن میں دو طرح سے واسطہ رہا ہے ایک یہ کہ اپنے ہائی سکول جاتے ہوئے مسلسل پانچ سال تک ہر روز اس کو عبور کر کے جانا پڑتا تھا اور اور دوسرا یہ کہ گاؤں سے کچھ فاصلے پر ہی ہمارے ددھیالی گاؤں موضع لنگر کے قریب ہمارے والد بزرگوار کی تعمیر کردہ پن چکی بھی اس نالے پر قائم تھی۔



چھٹی جماعت میں جب ہائی سکول باہتر میں داخل ہوا تو اس وقت میری عمر یہی کوئی دس گیارہ سال ہو گی سکول تک پہنچنے کیلئے چار پانچ کلومیٹر پیدل سفر کے علاوہ اس نالہ نندنا کو بھی عبور کر کے جانا ہوتا تھا۔ نالہ نندنا سے گزرتے وقت پانی میں فٹ ڈیڑھ فٹ پر رکھے ہوئے بڑے بڑے پتھروں کے اوپر سے گزرنا ہوتا تھا مگر دریا میں اکثر اوقات طغیانی (ہاڑ) کے دوران جوتے اتار کر ننگے پاؤں پانی سے گزرنا ہوتا تھا۔ سخت سردیوں میں تو یہ عمل انتہائی کٹھن اور تکلیف دِہ ہوتا تھا اور بڑی طغیانی کی صورت میں ہمیں یا تو سہارا دینے والے بڑے بڑوں کے بازو تھام کر نالا پار کرنا ہوتا یا پھر نالے سے طغیانی کے پانی کے اتر جانے کا انتظار کرنا پڑتا۔ نالے میں طغیانی کا عمل بھی بڑا عجیب وغریب ہوتا۔



کئی میل دور برسنے والی بارش کا پانی جب نالے میں پہنچ کر طغیانی کی شکل اختیار کرتی تو اس صورت میں نالے کی طغیانی کے دوران پہاڑی چٹانوں میں بپھری ہوئی لہروں اور اڑتی ہوئی جھاگ کا نظارہ کرنے کئی مرتبہ ہم نالے کے قریب کسی اونچی جگہ بیٹھ کر اس سے لطف اندوز ہوتے۔ کئی جیالوں کو اس طغیانی کے دوران تیراکی کرتے اور کئیوں کو دریا میں بہہ کر آنے والی بڑی بڑی لکڑیوں کو پکڑتے دیکھا اور انہی معصوم آنکھوں نے طغیانی کے دوران نالے میں بہہ کر آنے والی انسانی لاشوں کو بھی دیکھا۔ اچانک طغیانی آ جانے سے گاؤں کے کِسانوں کے جانوروں، پن چکیوں اور دریا کے اپنے پاٹ اور کناروں سے بپھر جانے سے کئی قیمتی چیزوں کو بہا لے جانے کے نظارے اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ اُس وقت ایک شاعر کا یہ شعر ضرور یاد آتا کہ

ے انساں کی آنکھ خشک تھی انسان کے ظلم پر
اور جب پہاڑ روئے تو سیلاب آ گیا

تاہم یہ تو نالہ نندنا کی بپھری ہوئی اور غضبناک شکل کا ایک عکس ہے مگر جیسے کہ پہلے بتایا ہے کہ اس نالے/ دریا پر ہماری زندگی کا دارومدار اور بہت سے مزے بھی وابستہ تھے۔ ہمارے گاؤں میں جب تک محکمہ واٹر سپلائی اور محکمہ بلدیات کی طرف سے آبنوشی کے نلکے نہیں لگے تب تک چمڑے کی مشکوں کے ذریعے لائے جانے والے پانی پر ہمارا مکمل انحصار تھا۔ ہمارے گاؤں میں دیگر پیشوں لوہار، ترکھان، حجام، جولاہے، مراثی اور موچی کے علاوہ ماشکی کا پیشہ بھی بہت اہم تھا۔ ماشکی کا کام چمڑے کی مشکوں میں نالے سے پانی بھر کر گدھوں پر لاد کر لوگوں کے گھروں میں پڑے ہوئے مٹی کے گھڑوں میں بھرنا ہوتا تھا۔ ماشکی اپنی پانی کی مشکوں سے گھروں میں ''گھڑونجی'' پر پڑے ہوئے مٹی کے حسبِ ضرورت گھڑے دن میں ایک مرتبہ بھر دیتا اور وہ تمام دن گھر میں پینے اور برتن وغیرہ دھونے میں صرف ہو جاتا۔ اسی طرح ماشکی مسجد کے احاطہ میں بنے ہوئے پانی کے بڑے ٹینک (مَٹ) کو بھی نالے سے مشکوں کے ذریعے لدے ہوئے پانی سے بھر دیتا یہ پانی جو وضو اور مرد حضرات کے غسل کے کام آتا۔ اس کے بدلے میں ماشکی کو سالانہ یا ششماہی کے حساب سے فصلوں سے عوِضانہ ملتا۔

بات نالا نندنا کی ہو رہی تھی۔ نالے کو روزانہ پتھروں کے ذریعے عبور کرنا

ے انہی پتھروں پہ چل کر اگر آ سکو تو آؤ
میرے گھر کے راستے میں کوئی کہکشاں نہیں ہے

کے مصداق ہمارا روز کا معمول تھا چنانچہ گرمیوں کے موسم میں وقت اور موقع دیکھ کر نالے میں Swimming انجوائے کرنا، نالے کے اضافی فوائد میں سے ایک تھا۔ اسی نالے کی گہری ''ڈھنڈوں'' میں ہم نے اپنے لڑکپن میں تیراکی سیکھی۔ اس لئے ہم بغیر کسی سوئمنگ پول کی فیس ادا کیے تیراکی جیسا مہنگا ہنر مفت میں سیکھ گئے۔

سکول سے تعطیلات کے دوران فارغ اوقات میں گھر والوں سے چھپ کر نالے میں تیراکی سے لطف اندوز ہونا اور خاص کر نالے کے سیلابی دنوں میں پانی کے بہاؤ کے ساتھ تیراکی کرنا بھی ہمارا محبوب مشغلہ رہا ہے۔

دریائے نندنا میں پائی جانی والی مہاشیر مچھلی کا شکار کر کے گھر لانا اور پھر ہماری والدہ ''بے جی'' کا اس کو میٹھے تیل میں روسٹ کر کے پیش کرنا اس کی لذت کام و دہن آج تک ہم نہیں بھول سکتے مچھلی کے علاوہ نالے کے پانی کی گہرائیوں میں اور کئی قسم کے آبی جانور پائے جاتے تھے جن میں کچھوے، سانپ نما مچھلی، اُدرُ واور سیپیوں اور گھونگوں والے آبی جانور پائے جاتے۔ کچھوے تو نالے کے اندر تیرتے ہوئے اور نالے کے کنارے کبھی کبھی محوِخرام'' کچھوا چال'' چلتے ہوئے ہم نے خود بھی دیکھے مگر کہا جاتا ہے کہ آج کل نہ صرف کچھوے بلکہ تمام قسم کے آبی جانور اس نالے سے معدوم ہو چکے ہیں۔ آج کی نسل کے بچوں کو ہم صرف چڑیا گھر یا کتاب میں ہی کچھوے کی شکل دکھا سکتے ہیں یا نیٹ اور سوشل میڈیا کی وڈیوز میں ہی یہ آبی جانور دیکھے جا سکتے ہیں۔

رہٹ



نالہ نندنا کی اہمیت زراعت اور گاؤں کی زرعی خود کفالت کے لحاظ سے بھی کم نہ تھی۔ نالہ نندنا زیادہ تر گاؤں کے جنوب میں بہتا ہے مگر اس کی گہرائیوں کے دونوں اطراف وسیع اور زرخیز زرعی اراضی واقع تھیں۔ صدیوں کے تجربات سے گزر کر گاؤں کے لوگوں نے ایسے ذرائع ایجاد کر لیے جن سے نالہ نندنا کے دائمی پانی سے زرعی آبپاشی کا کام لیا جا سکتا تھا۔ ہوتا یہ تھا کہ نالہ سے تقریباً ایک سو گز یا بعض اوقات پچاس گز ہٹ کر عمودی جگہ پر کنواں کھود لیا جاتا۔ کنویں کی تہہ کو کھود کر اس سطح تک لایا جاتا کہ اس کی تہہ نالا نندنا کی سطح سے نیچے چلی جاتی پھر نالہ میں ہلکا سا بند دے کر اُس کنویں کی طرف ایک سرنگ کھودی جاتی۔ اب نالے کا صاف ستھرا پانی اسی سرنگ کے ذریعے کنویں میں ڈال دیا جاتا اور کنویں سے رہٹ کے نظام کے ذریعے پانی اوپر کھینچ کر زمینوں کو سیراب کیا جاتا۔

نالے سے کنویں تک پانی پہنچانے والی سرنگ کو مقامی زبان میں ''ہَوِیری'' کہتے تھے اس طرح انہی ہَویریوں کے ذریعے نالہ نندنا کے اوپر پر بیسیوں رہٹ بنا کر زمینیں سیراب کی جاتیں۔ انہی زرخیز زمینوں میں ہر قسم کی سبزیاں مثلاً مُولی، گاجر، شلجم، کدُو، کھیرا اور ٹینڈا، پیاز اور لہسن وغیرہ وافر مقدار میں پیدا کی جاتیں

جو گاؤں کی سبزی اور پھل کی ضرورت میں گاؤں کو نہ صرف خود کفیل رکھتیں بلکہ منڈیوں میں ان کی فروخت کر کے کسان اپنے معاشی مسائل حل کرتے۔

گاؤں کی مسجد:

بچپن کی یادوں میں گاؤں کی مسجد کا تذکرہ ضروری ہے۔ ہمارے گاؤں میں تین مساجد تھیں۔ ہماری مسجد ہمارے گھر کے قریب اور گاؤں کی سب سے اونچی مسجد تھی ابتدا میں اس کو ''ترکھانڑاں والی'' اور بعد میں ہمارے والد محترم کے آجانے کی وجہ سے ''پیراں والی'' مسجد کہلائی جانے لگی۔ بچپن میں ہی نماز پڑھنے کی عادت تو راسخ ہو چکی تھی مگر مسجد ہم بچوں کے لئے ایک تفریح کی جگہ بھی تھی۔ مسجد میں ظہر کی نماز سے پہلے کوئی ہوتا بھی نہیں تھا اس لیے ہم دیگر لڑکوں کے ساتھ مل کر کھل کر شرارتیں کر سکتے تھے۔ مسجد کی دیواروں، محرابوں، برآمدوں اور چھتوں میں چڑیوں کے گھونسلے ڈھونڈ کر ان کے انڈے اور بچے تلاش کرنا ہمارا محبوب مشغلہ ہوتا تھا اس کے علاوہ مسجد کے مشرقی خالی حصے میں لگے شہتوت اور بیری کے درختوں پر چڑھ کر ان کے پھل کھانا اور دیگر چھوٹی موٹی شرارتیں کرنا اور نماز کا وقت ہو جانے پر وضو کر کے نماز کے لئے کھڑے ہو جانا ہمارے معمولات میں شامل تھا۔

اسی عرصے کی بات ہے یعنی پرائمری سکول کے زمانے میں عصر کے وقت جب ہم چند لڑکے تیار ہو کر جماعت کی نماز کیلئے کھڑے تھے اور دیگر نمازیوں کی آمد جاری تھی تو گاؤں کے ایک معزز آدمی غلام احمد خان (مرحوم) (مَہمند خان) آ گئے۔ انہوں نے جب ہمیں اِدھر اُدھر شرارتیں کرتے اور بھاگ دوڑ کرتے دیکھا تو ہمارے قریب آئے اور اپنے سر کی بڑی سی پگڑی اُتار کر میرے سر پر رکھی اور مجھے کہنے لگے کہ آپ ان کی جماعت کراؤ۔ چنانچہ میں آگے کھڑا ہو گیا اور میرے پیچھے تین مقتدی لڑکے بھی کھڑے ہو گئے تو میں نے اپنی زندگی کی نماز کی پہلی امامت مکمل کر لی۔

ہماری مسجد گاؤں کے سب سے بلند مقام پر خوبصورت تراشیدہ پتھروں اور چونے سے تعمیر کی گئی تھی۔ چھت پر تین خوبصورت مینار تھے جن پر میناکاری سے خوبصورت نقش و نگار بنے ہوئے تھے جس کو اگلے وقتوں کے سنگتراشوں اور کاریگروں نے نہایت جانفشانی اور فنکاری سے تعمیر کیا تھا۔

سب سے اگلا ہال ایک بڑا بند کمرہ تھا۔ جس کا کچا چھت ناتراشیدہ لکڑیوں (ورگوں) اور شہتیروں سے بنا تھا۔ مگر اس کا دروازہ جو غالباً آج بھی موجود ہے مضبوط لکڑی کا بنا ہوا تھا اور اس پر لکڑی کا خوبصورت کام نہایت محنت سے کیا گیا تھا۔ اس ہال نما بند کمرے میں عموماً سردیوں میں نماز کا اہتمام ہوتا۔ سردیوں میں سردی بڑھ جانے پر فرش پر قالین یا دریوں کی جگہ ایک جنگلی گھاس ڈال دی جاتی جو قالین جیسی نرمی کے علاوہ فرش کو گرم رکھنے کا کام بھی کرتی تھی۔

باہر کا ہال بھی نسبتاً نیا، زیادہ کشادہ اور پکے چھت یعنی چیڑ اور دیودار کے تراشیدہ ''بالوں'' اور ''کڑیوں'' (شہتیروں) سے تعمیر کیا گیا تھا۔ وضو اور غسل کے لیے داخلی دروازے کے ساتھ بھی ایک پانی کا ٹینک (مَٹ) پتھر چونے اور ایک خاص قسم کی چونے کی بھٹی کی مٹی کے آمیزے سے تیار کیا گیا تھا جو ایک طرف سے زمین سے اونچا تھا اور گاؤں کا ماشکی سیڑھیوں پر چڑھ کر عقب سے مشکوں سے پانی ڈال کر اسے بھر دیتا۔ سیڑھیوں کے ساتھ مَٹ کے نیچے پانی گرم کرنے کے لیے جگہ تھی جہاں سردیوں میں لکڑیاں جلا کر ٹینک کے پانی کو گرم کرنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی تین بڑے غسل خانے استنجا وغیرہ کے لیے تعمیر کئے گئے تھے۔ گاؤں سے باہر دور سے جس سمت سے بھی نظر پڑتی تو مسجد اپنی بلندی اور خوبصورتی کی وجہ سے پورے گاؤں کے درمیان میں کھڑی ایک دلہن کا منظر پیش کرتی۔

بچپن میں گاؤں کے پیشہ ور لوگ

ہمارے ماضی میں گاؤں کی زندگی کے حقیقی کردار وہ لوگ تھے جن کے دم قدم سے گاؤں کی زندگی رواں دواں تھی بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ زندگی انہی کی وجہ سے زندہ تھی۔ آجکل کے طبقاتی معاشروں پیشے یا مخصوص پیشہ اختیار کرنے والوں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا حالانکہ انہیں پیشوں کے دم قدم سے ہمارا معاشرہ بنتا ہے اور انہی پیشوں کی وجہ سے معاشرہ ترقی کرتا ہے۔

پیشوں کی اہمیت اور ان کے کے وقار کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ ہمارے پیغمبران اور انبیاء کرامؑ نے خود کئی پیشے اختیار کیے اور انہیں اختیار کر کے معاشرے میں ان کو عزت و تکریم دی۔ مختصراً عرض کرتا چلوں۔

حضرت آدم علیہ السلام نے نے اولاً کپڑا بننے کا کام شروع کیا اور بعد میں کھیتی باڑی میں مشغول ہو گئے۔ حضرت نوح علیہ السلام لکڑی کا کام کرتے تھے یعنی بڑھئی تھے۔ حضرت ادریس علیہ السلام نے کتابت اور درزی کا پیشہ اختیار کیا۔ حضرت ہُود اور صالح علیہ السلام تجارت کرتے تھے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کھیتی باڑی، حضرت شعیب علیہ السلام جانور پالتے یعنی چرواہے کا پیشہ، جبکہ موسیٰ علیہ السلام بکریاں چراتے اور داؤد علیہ السلام زرہ بناتے۔ ہمارے نبی آخر الزمان اور امام الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بچپن میں بکریاں چرائیں اور بڑے ہو کر حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مال سے تجارت فرمائی۔ قابل افسوس امر یہ ہے کہ ہمارے ابتدائی تعلیمی سلیبس میں ان پیشوں اور ان کی اہمیت اور عزت و تکریم کے بارے میں بہت کم بتایا گیا ہے۔ My School Peon, The Postman وغیرہ کے بارے میں تو مضامین لکھوائے جاتے ہیں مگر معاشرے کے ایسے پیشوں اور محنت کشوں کے بارے میں بہت کم بتایا جاتا ہے جو ہمارے معاشرے کے حقیقی معمار ہیں اور جن کا عزت و تکریم سے ذکر ہمارے طبقاتی معاشرے میں اونچ نیچ کو ختم کر کے محنت کی عظمت اور محنت کش کی عزت کا باعث بن سکتا ہے۔

زمیندار/ مزارع/ ملیار/ کِسان:

گاؤں کا یہ وہ کردار ہے جو ہماری زندگی کی بنیادی ضروریات یعنی خوراک مہیا کرتا تھا زمیندار سے



میری مراد کسی طرح بھی چوہدری، خان یا وڈیرہ نہیں بلکہ زمین دار وہ شخص تھا جو زمین میں ہل چلاتا، پانی دیتا، گوڈ کرتا، فصلیں اور سبزیاں کاشت کرتا اور پھر انہیں اکٹھا کر کے ہماری خوراک کے لیے بھیج دیتا۔ مجھے یاد ہے بچپن میں گرمیوں میں ہم کوٹھے (مکان کی چھت) پر سوتے تھے، کبھی کبھی رات گئے یا علی الصبح آنکھ کھل جاتی تو قریبی کھیتوں سے کسان کی ہل کے بیلوں کی جوڑی کو ہانکنے کی آوازیں ہمیشہ سنائی دیتیں۔ اسی طرح جیٹھ ہاڑ اور ساون کے مہینوں میں تپتی دھوپ میں بھی کسان اپنے ہل کی جوڑی ہانکتے اور ملیار دھوپ سے بچنے کے لیے سروں پر پگڑی یا چادر رکھ کر فصلوں اور سبزیوں کی بوائی اور گوڈی میں مصروف ہوتے۔ حضرت جوش ملیح آبادی نے اس کسان کے بارے میں کیا خوبصورت اشعار کہے ہیں آپ بھی پڑھیے۔

کسان (نظم)

ناظرِ گُل، پاسبانِ رنگ و بُو، گلشن پناہ
ناز پرور، لہلہاتی کھیتیوں کا بادشاہ

وارثِ اسرارِ فطرت، فاتحِ امید و بیم
محرمِ آثارِ باراں، واقف ِطبعِ نسیم

دوڑتی ہے رات کو جس کی نظر افلاک پر
دن کو جس کی انگلیاں رہتی ہیں نبضِ خاک پر

سرنگوں رہتی ہیں جس سے، قوتیں تخریب کی
جس کے بوتے پر لچکتی ہے کمر تہذیب کی

دھوپ کے جھلسے ہوئے رَخ پر مشقت کے نشاں
کھیت سے پھیرے ہوئے منہ گھر کی جانب ہے رواں

ٹوکرا سر پر، بغل میں پھاوڑا، تیوری پہ بل
سامنے بیلوں کی جوڑی، دوش پر مضبوط ہل

کھیتی باڑی اور زمینداری سے ہمارا ذاتی اور خاندانی واسطہ بھی تھا۔ اس لیے کسان اور اس کی مشقت سے ذاتی آ گاہی بھی حاصل ہے۔ ہمارے والد مرحوم وقتاً فو قتاً اپنی زمینوں میں خود بھی مشقت فرماتے اور ہمیں بھی اس کی تلقین کرتے۔ سادہ دل کسانوں سے دل سے محبت کرتے اور ان کی کی ہر قسم کی مدد فرماتے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ والد بزرگوار ایک عالمِ باعمل شخص تھے مجھے اور صرف اپنے گاؤں کے لوگوں کے لئے ہی نہیں بلکہ دور دراز کے اضلاع کے اپنے مُریدین اور عقیدتمندوں کی دینی رہنمائی اور رشد و ہدایت کا فریضہ بھی انجام دیتے تھے۔ تاہم مذہبی امور کو کبھی بھی پیشے کے طور پر اختیار نہیں کیا بلکہ بچوں اور خاندان کے لیے حصول رزق حلال کے لئے کھیتی باڑی کو ہی ذریعہ بنایا۔ والد مرحوم کو مطالعہ کا بھی شوق تھا لہٰذا کھیتی باڑی کا کام صِرف نگرانی تک ہی محدود رہتا۔ تاہم اپنی زمینوں میں سبزیاں اپنی ضروریات کے لیے کاشت کرتے تو ان کو چشمے کے ذریعے پانی دینا اور گوڈی وغیرہ خود کرنے سے کبھی نہ ہچکچاتے۔ ہماری زمینوں میں والد صاحب اکثر پیاز، لہسن، مرچ اور دھنیا وغیرہ اپنی ضرورت کے لئے خود کاشت کرتے اور اکثر اپنی ضرورت سے زائد پیداوار فروخت کر دیتے۔ پیاز اور تھوم ہماری زمینوں میں بڑی مقدار میں پیدا ہوتے۔

زمینوں میں جن کو ہم ''باغ'' کے نام سے ہی یاد کرتے پھلوں کے کافی درخت تھے۔ تُوت، شہتوت انگور اور بعد میں خوبانی اور مالٹے کا باغ بھی ہمارے بھائیوں نے لگوایا تھا۔ ہماری آبائی زمینوں میں شہتوت کے دو بڑے درخت تھے جن پر انتہائی میٹھے اور لذیذ پھل لگتے۔ بچپن میں ہم مارچ۔ اپریل اور مئی میں جب زمینوں میں کام کے لیے جاتے تو اس بڑے شہتوت پر خود چڑھ کر میٹھے اور پکے ہوئے شہتوت کھانا ہمارا مشغلہ ہوتا تھا۔ اس موسم میں اردگرد کے کسانوں کی عورتیں اور لڑکیاں گروپوں کی شکل میں آتیں اور واپسی پر شہتوت کا پھل اپنی اپنی پٹوریوں میں بھر کر لے جاتیں۔ شہتوت کے علاوہ انگور، مالٹے، انار اور نارنج (کھٹے) بھی باغ کی پیداوار کا حصہ ہوتے۔ اس عظیم الجثہ شہتوت کے پھل کھانے کے علاوہ گرمیوں میں ہم کام کے بعد اس کی گھنی چھاؤں تلے بیٹھ کر ستانے کا کام بھی لیتے۔ اسی منظر اور پیشہ کاشتکاری کی سادگی کو ایک شاعر نے مقامی زبان میں اس طرح بیان کیا ہے۔

اَپڑاں گراں ہووے۔ تُوتے دی چھاں ہووے
منجی ہووے وانڑے دی۔ تے سِرے تلے بانہہ ہووے

ترجمہ: اپنا گاؤں ہو، شہتوت کے درخت کی چھاؤں تلے بان کی چارپائی پر سر کے نیچے بازو رکھ کر لیٹے ہوں تو کتنا لطف آتا ہے۔

ہماری زمینوں کو سیراب کرنے والے ٹھنڈے پانی کا ذکر اگر نہ کریں تو زیادتی ہوگی۔ ہماری اور ہمارے رشتہ داروں کی زمینوں کے کچھ حصہ کو یہی چشمہ سیراب کرتا تھا جو زمینوں کے شمال میں آخری حصے میں واقعہ تھا۔ اس چشمے سے چوبیس گھنٹے بہنے والے پانی کو چند قدم نیچے ایک تالاب میں جمع کیا جاتا اور جب ایک رات دن میں یہ بھر جاتا تو مصنوعی طور پر بنائے گئے پائپ کو کھول کر اس سے زمینوں کو آبپاشی کے لیے استعمال کیا جاتا۔ اس چشمے کا پانی اتنا میٹھا اور صاف ہوتا کہ ہم نالیوں میں آنے والے پانی کو کسی بھی جگہ پر پی کر اپنی پیاس بجھا لیتے۔ ہمارے ددھیالی گاؤں لنگر میں بھی ہماری کافی زمین تھی جو نالے کے کنارے قائم شدہ ایک رہٹ کے ذریعے سیراب ہوتی تھی۔ یہی زمین آج بھی ہمارے رزقِ حلال کے حصول کے ایک حصے کے طور پر موجود ہے۔ ہمارے روزگارِ حیات اور کاروبار کے ذرائع بدل جانے کی وجہ سے اب اس پر کاشتکاری، مزارعین کے ذریعے ہی ہوتی ہے۔

پن چکی:



پن چکی

زمینداری اور کاشتکاری کے ساتھ ساتھ ہماری آمدنی کا ایک بڑا ذریعہ ہماری زمینوں کے قریب ہی نالہ نندنا پر قائم پانی سے چلنے والی پن چکی بھی تھی۔ جو ہمارے والد صاحب نے اس نالے کے اِردگرد کی زمین خرید کر تعمیر کی تھی۔ یہ پن چکی گندم، مکئی کی پسائی کے لیے مشہور تھی اور ملوں سے لوگ غلہ خود اٹھا کر یا جانوروں پر لاد کر پسائی کے لیے لاتے تھے۔ اس پن چکی کی نگرانی اور اسے چلانے کے لیے ایک پسنہارا (جندروئی) چوبیس گھنٹے یہاں موجود رہتا۔ غلے کی پسائی کے بعد نقد رقم کی بجائے ایک خاص شرح سے پسائی کا غلہ وصول کر لیتا۔ بعد ازاں ایک دن بعد غلہ اٹھا کر ہمارا حصہ ہمارے گھر لے آتا اور اپنا حصہ اپنے بچوں کے لئے رکھ لیتا۔

لوہار اور ترکھان:



لوہار

یہ دو الگ الگ محنت کش ہیں جن کے پیشے بھی الگ الگ ہیں اور نام بھی الگ، مگر بعض دیہاتوں میں ایک ہی شخص لوہار اور ترکھان دونوں کے کام بیک وقت ایک ہی آدمی کرتا ہے۔ ہمارے اپنے گاؤں میں لوہار اور ترکھان الگ الگ پیشے کے طور پر کام کرتے تھے۔ عموماً یہ اپنے گھر کے ہی ایک ہی حصے میں اپنی ورکشاپ پر کام کرتے تھے۔ لوہار پر انگریزی زبان کی ایک مشہور نظم۔

The village blacksmith by (Henry Wadsworth Longfellow)

Under a spreading chestnut tree
The village smithy stands;
The smith, a mighty man is he,
With large and sinewy hands,
And the muscles of his brawny arms
Are strong as iron bands.
His hair is crisp, and black, and long;
His face is like the tan;
His brow is wet with honest sweat,
He earns whate'er he can,
And looks the whole world in the face,
For he owes not any man.
Week in, week out, from morn till night,
You can hear his bellows blow;
You can hear him swing his heavy sledge,
With measured beat and slow,
Like a sexton ringing the village bell,
When the evening sun is low.

گاؤں کا لوہار

اردو ترجمہ

ایک پھیلتے ہوئے شاہ بلوط کے درخت کے نیچے۔۔۔۔۔
گاوں کا لوہار کھڑا ہے۔۔۔۔۔
یہ لوہار، کیا ہی طاقتور انسان ہے۔۔۔۔۔۔
لامبے اور سخت گوشت سے پر، ہاتھ ہیں اس کے۔۔۔۔۔۔
اور اس کے بھورے بازوؤں کے پٹھے۔۔۔۔۔۔
اتنے سخت کہ جیسے لوہے کے پٹے۔۔۔۔۔۔
بال ہیں اس کے کرکرے، کالے اور لمبے۔۔۔۔۔۔
چہرہ اس کا کتھے جیسا۔۔۔۔۔
بھویں اس کی گیلی ہو گئیں، محنت کے پسینے سے۔۔۔۔۔۔۔
وہ کماتا ہے جتنا بھی کما سکتا ہے۔۔۔۔۔۔
اور دیکھتا ہے دنیا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے۔۔۔۔۔۔
کیونکہ وہ کسی کا زیر بار احسان نہیں ہے۔۔۔۔۔۔
پورا ہفتہ، دن اور رات۔۔۔۔۔۔
آپ سن سکتے ہیں اس کی دھونکنی کی پھنکارتی آواز۔۔۔۔۔۔
آپ سن سکتے ہیں اس کے بھاری ہتھوڑے کا گھماؤ۔۔۔۔۔۔
نپی تلی اور آہستہ ضربوں کے ساتھ۔۔۔۔۔۔
جیسے گاؤں میں گھنٹہ بجائے گاؤں کا گھنٹال۔۔۔۔۔۔
جب شام کا سورج افق سے اترے۔۔۔۔۔۔

(ترجمہ ڈاکٹر اسد حسین شاہ بفرمائش ڈاکٹر سید چراغ حسین شاہ)

1967 میں اپنے بی-اے کے انگریزی کورس کی کتاب میں جب پروفیسر لطیف صاحب یہ نظم پڑھاتے تو مجھے اپنے گاؤں کے ماما سید رسول لوہار یاد آ جاتے۔ ویسے تو ہمارے گاؤں میں لوہاروں کی تین چار دکانیں (ورکشاپ) تھیں مگر ماما سید رسول ہمارے گھر کے قریب تھے۔ پنج وقتہ نمازی اور قرآن کی باقاعدہ

تلاوت۔عصری تعلیم تو شاید بہت کم تھی۔وہ اپنی دکان میں دھونکنی کے قریب بیٹھے ہوتے (دھونکنی چمڑے کا ایک بڑا ڈبہ ہوتا تھا) جس کے ایک سرے پر لکڑی کے ساتھ زنجیر لگی ہوتی تھی جس کو کسان ان کے سامنے بیٹھ کر اوپر نیچے کرتے۔زنجیر کو نیچے کھینچنے سے چمڑے کا ڈرم سمٹتا اور اس کے اندر کی ہوا پائپ کے ذریعے چھوٹی سی بھٹی میں آ کر کوئلوں کو دہکانے میں مدد دیتی۔

بھٹی میں لوہے کے مختلف شکل کے پٹے یا ٹکڑے پڑے ہوتے اور وہ ٹکڑے جونہی گرم ہو کر سرخ ہوتے تو لوہار فوری طور پر ان کو اپنے سامنے رکھے ہوئے لوہے کے بڑے ٹکڑے پر رکھ کر ان کو موٹے ہتھوڑے سے کوٹ کر ان کو مطلوبہ شکل دیتا۔اگر لوہے کے کسی بڑے ٹکڑے کو "مولڈ" کرنا ہوتو اس کے لئے سامنے بیٹھے ہوئے کسان کو بڑا ہتھوڑا (وَدّان) دے کر اسے سُرخ لوہے پر پے در پے ضربیں لگانے کے لیے کہا جاتا اور دیکھتے ہی دیکھتے لوہے کا سرخ دہکتا ہوا ٹکڑا مطلوبہ شکل میں بدل جاتا۔ہم نے بچپن میں لوہار کو اس طرح سے کئی قسم کی چیزیں بناتے ہوئے دیکھا۔لوہار عموماً کسانوں کے لیے ہل کا سنبہ، کلہاڑی، کدال، درانتی اور چاقو چھریاں، تالے چابیاں اور عمارتی آلات تیار کرتے تھے۔

ترکھان:



ترکھان

ترکھان لکڑی کا کام کرنے والے کو کہتے ہیں۔ گاؤں میں عموماً کوئی بڑے فنکار قسم کے لکڑی کا کام کرنے والے نہیں ہوتے بلکہ ان کا کام بھی گاؤں کے لوہار کی طرح کسانوں اور زمینداروں کے لئے اس وقت کی ضرورت کے زرعی آلات تیار کرنا ہوتا تھا۔ گاؤں کے ترکھانوں میں ماما کامل دین ترکھان قابل ذکر ہے۔وہ ہمارا ہمسایہ تھا اور اس کی دکان (ورکشاپ) بھی گھر کے ہی ایک حصے میں ہوتی تھی۔وہ گاؤں کے کسانوں کے لیے ہل اور اس کی Accessories۔کَسّی، بیلچہ، کُھرپہ، کدال، ترینگل اور اسی قسم کی دیگر اشیاء بناتا تھا۔ اس کے بیٹے ہمارے بچپن کے دوست تھے لہٰذا ہم اُس کی ورکشاپ میں گھنٹوں بیٹھ کر اسے

تیشہ چلاتے ہوئے دیکھتے۔ تیشے کے علاوہ آری، رَندہ، برمہ (لکڑی میں سوراخ کرنے والا آلہ) اور لکڑی میں بڑا سوراخ کرنے اور جوڑ لگانے کے لیے استعمال ہونے والا آلہ ''ستھرا'' بھی استعمال ہوتا تھا۔

گاؤں کا ترکھان کسانوں کا سب سے بڑا مددگار اور ان کی روزمرہ استعمال ہونے والے زرعی آلات تیار کر کے مہیا کرنے والا اہم کردار تھا۔ زرعی مددگار کے علاوہ گھروں میں استعمال ہونے والی لکڑی کی تمام اشیاء مثلاً چارپائی، پیڑھی، چاقو چھریوں کے دستے، گھڑونجی، مدھانی اور دیگر اشیاء بھی ترکھان ہی بنا کر دیتا تھا۔ اس طرح لوہار اور ترکھان کا نہ صرف ہماری معیشت میں بلکہ ہماری تہذیب و معاشرت میں بھی اہم کردار تھا۔

موچی:



موچی کا کام جُوتے بنانا اور ان کی مرمت کرنا ہوتا تھا۔ چند ماہر قسم کے موچی ہمارے بچپن میں خواتین کے تِلہ دار جوتے بناتے تھے مگر وہ آہستہ آہستہ کم ہوتے گئے البتہ جوتوں کی مرمت کرنے والے موچی موجود رہے۔ مرمت کا کام اس لیے بھی اہم تھا کہ ہمارے گاؤں کے پتھریلے راستوں میں چمڑوں کے جوتے اکثر جلدی پھٹ جاتے اور انہیں مرمت کئے بغیر نہیں پہنا جا سکتا تھا۔

حجام (نائی):



حجام بھی گاؤں کے تمدن کا ایک اہم کردار تھا۔ وہ نہ صرف مردوں اور بچوں کے بال کاٹتا بلکہ گاؤں میں ہونے والی ہر غمی اور خوشی میں پیغام رسانی کا کام بھی کرتا تھا۔ شادی کے رسمی پیغامات گاؤں کے تمام گھروں تک اور دوسرے گاؤں میں رشتہ داروں تک پہنچانا بھی ''نائی'' کے اہم فرائض میں شامل ہوتا۔ دھاگے کو گرہ لگا کر اسے نائی کے ذریعے دوستوں اور عزیزوں کو بھجوانا آج کل کے دعوتی کارڈ یا شادی کارڈ کے مترادف سمجھا جاتا تھا۔

بچپن میں نائی سے بال کٹوانا خاص کر استرے سے سر گنجا کروانا ہماری چند تکلیف دہ یادوں میں شمار ہوتا تھا۔ بابا مرزا نائی اور غلام محمد نائی کے کُند استرے سے ہمارے سروں سے کئی دفعہ خون نکلا۔ کُند استرے کی اس کارستانی سے ہمارے سروں کے زخموں سے بہنے والا خون تو ہماری والدہ کو نظر آ جاتا اور وہ سر کو دھونے کے ساتھ ساتھ ہمارے سر کے زخموں کو بھی دھوتیں مگر بال کٹاتے وقت ہماری آنکھوں سے درد سے بہنے والے آنسو تو مٹی میں ہی جذب ہو جاتے کیونکہ ہمیں اس عمل کے دوران سر کو مکمل جُھکا کر رکھنے اور زمین پر دیکھنے کی سخت ہدایت ہوتی تھی۔

دھوبی:

دھوبی یاد جسے کا پیشہ بھی ان دنوں میں مکمل معدوم تو نہیں ہوا تھا مگر ان پیشوں میں شامل تھا جو معدوم ہونے کے قریب تھے۔ ہم نے اپنے بہت ہی بچپن میں ان دھوبیوں (دھبوں) کو لٹھے کی سفید چادروں کو لحاف کی شکل دینے کے لئے ٹھپوں کے ساتھ رنگ کرنے اور اس رنگ کو پھر بھٹیوں میں رنگ پکا کرتے ہوئے دیکھا۔ دھوبیوں کی اگلی نسل میں اپنے آبائی پیشے کی طلب میں کمی کو دیکھتے ہوئے چند دوسرے پیشوں سے منسلک ہو گئے۔ چنانچہ کچھ نائی (حجام) اور چند دھبوں نے شادیوں اور دیگر تقریبات میں کھانے پکانے کی ذمہ داری سنبھال لی۔ اسی طرح وہ دھوبی اور نائی ہوتے ہوئے اپنے آپ کو باورچی کہلانے میں خوشی محسوس کرتے۔

جولاہے:

انسانی تہذیب وتمدن کو نکھارنے اور اسے ترقی دینے میں جولاہے کے پیشے کی اہمیت بھی کسی سے کم نہیں اس پیشے کا وجود اس وقت سے پایا جاتا ہے جب انسان نے درخت کے پتوں اور شاخوں سے جسم کو ڈھانپنے کی بجائے متبادل ذرائع کی تلاش شروع کی ہو گی۔ اس پیشے کو بھی دیگر پیشوں کی طرح بہت سے پیغمبروں نے رزقِ حلال کمانے کے لئے اختیار کر کے اس کی عزت ووقار میں اضافہ کیا۔

بچپن میں ہم نے اپنے گاؤں میں ایک ہی بزرگ انسان کو کھڈی پر بیٹھے ہوئے دیکھا تو اس پیشے سے متعارف ہوئے۔ بابا گاما (شاید غلام محمد نام تھا) کے گھر جب بھی ہم جاتے تو وہ عینک لگائے کھڈی پر بیٹھا ہوتا اور سوتی کپڑا کھڈی پر بن رہا ہوتا۔ کھڈی پر کام شروع کرنے سے پہلے سُوت کی تانی بنائی جاتی۔ چرخے پر

تکلے کے ذریعے کاتے ہوئے دھاگے کو عموماً پندرہ بیس گز لمبی ڈوریوں میں نزدیک نزدیک رکھ کر تانی بنائی جاتی۔اور پھر اس کو بڑی نفاست سے کھڈی پر لگا دیا جاتا۔کھڈی پر ''تانے'' کے دوسری طرف یعنی چوڑائی کے لیے ''بانا'' بنایا جاتا۔(آج بھی کپڑا دو قسم کے دھاگوں سے تیار کیا جاتا ہے۔ایک لمبائی کے لیے اور ایک چوڑائی کے لئے اور انہی دھاگوں کو ''تانا بانا'' کہا جاتا جو بعد میں کسی بھی کام کی پیچیدگی کے لئے اردو میں بطور محاورہ استعمال ہونے لگا)۔بابا گاما بہت عمر رسیدہ شخص تھا ہم جب بھی ان کے گھر اپنے ہم عمر بچوں سے کھیلنے



جاتے تو وہ ہمیں دیکھ کر بہت خوش ہوتا اور اکثر یہ جملہ دو تین دفعہ زبان سے دہراتا۔''اَساں نے پیر آئے نے'' ''اَساں نے پیر آئے نے''

؎ خاک میں کیا صورتیں تھیں کہ پنہاں ہوگئیں

بابا گاما کی وفات کے بعد اس کے ایک دو بیٹوں، بھتیجوں کو کپڑا بناتے ہوئے اور خاص کر سوت کی گرم چادریں بناتے ہوئے دیکھا مگر پھر انہوں نے بھی اس پیشے سے ہاتھ کھینچ کر سرکاری ملازمتیں اور دیگر پیشے اختیار کر لیے۔اس پیشے کے ساتھ بھی وہی سانحہ ہوا جو کام والے دیگر پیشوں کے ساتھ ہوا تھا۔یعنی شہروں میں

بڑی تعداد میں کپڑے کی ملیں لگ جانے جانے سے زیادہ نفیس اور نسبتاً ارزاں کپڑا دستیاب ہو جانے سے گاؤں کے جولاہوں کا پیشہ بھی ختم ہو گیا۔

چرواہے:

چرواہے کا پیشہ بھی گاؤں کی معیشت اور تمدن کا ایک اہم حصہ ہے۔ چرواہے کا کام بکری، بھیڑ، گائیں، بھینس، اونٹ اور اس طرح کے دیگر پالتو جانور رکھنا ہوتا ہے۔اس پیشے کا آغاز بھی ازمنہ قدیم میں اس وقت ہوا ہوگا جب انسان نے اپنی خوراک کے لئے جنگلی جانوروں کا شکار ترک کر کے چند جانوروں کو سدھا رکر اپنے گھر پر رکھنا شروع کیا۔ جانوروں کی اپنی اپنی فطرت کے مطابق جو نرم طبیعت کے جانور سدھار لیے گئے وہ گھریلو جانور کہلائے اور جو سدھارے نہ جا سکے وہ آج بھی جنگلی جانور کے طور پر پائے جاتے ہیں۔بچپن میں گاؤں میں کئی خاندانوں نے چرواہوں کا پیشہ اختیار کیا ہوا تھا۔اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ ہمارا گاؤں کالا چٹا پہاڑ کے قریب واقع تھا اور کالا چٹا پہاڑ کے گھنے اور سرسبز جنگلات میں جانوروں کی خوراک کا وافر انتظام موجود تھا، چنانچہ ہمارے گاؤں کے بیشتر خاندانوں نے بکریوں، بھیڑوں اور گائے بھینس کے بڑے بڑے ریوڑ پالے ہوئے تھے بلکہ یوں سمجھیں کہ گاؤں کی معیشت کا زیادہ تر دارومدار بھیڑ بکریاں اور جانور پالنے میں تھا۔ گاؤں کے اس پیشے کے ساتھ بھی دلچسپ رومانی کہانیاں بیان کی جاسکتی ہیں مگر ان صفحات میں ان کی گنجائش نہیں ہے۔تاہم ہم نے اپنے بچپن میں گاؤں کے اردگرد پہاڑی وادیوں میں بڑے بڑے ریوڑ چرانے والے چرواہوں کو کئی مرتبہ بانسری بجاتے ہوئے سنا اور انہیں یاد کر کے بانسری کی یہ آواز آج بھی ہمارے کانوں میں رس گھول دیتی ہے۔ چرواہوں کے پیشے کا ذکر ختم کرنے سے پہلے میں بتا تا چلوں کہ یہ پیشہ آج بھی ہمارے ملک کے دیہی علاقوں میں بدستور موجود ہے اور نہ صرف ہمارے ملک میں بلکہ ترقی یافتہ اور متمدن کہلانے والے ممالک میں بھی آپ مختلف جانوروں کے ریوڑ دیکھ سکتے ہیں۔ اپنے بیٹے ثاقب حسین شاہ کی سعودی عرب میں ملازمت کے دوران مجھے کئی مرتبہ نہ صرف عمرے کی سعادت کا موقع مِلا بلکہ سعودی عرب کے دور دراز علاقوں کا سفر کرنے اور سیاحت کے لیے بہت سے ممنوعہ علاقوں کو دیکھنے کا موقع بھی ملا۔ غالباً 2014ء یا 2015ء میں سعودی عرب میں مدینہ طیبہ میں رہائش کے دوران جلیل القدر صحابی اور درویش منش انسان

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالی عنہ کے مزار پر جانے کا ارادہ کیا۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالی عنہ کا مزار مکہ اور مدینہ کی بڑی شاہراہ کے بالکل وسط سے دائیں طرف جانے والی سڑک کے آخر میں ''البذر'' کے مقام پر واقع ہے۔ ''البذر'' کے مقدس قصبے تک پہنچنے اور مظلوم صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مزار تک تو ہم بوجوہ نہ پہنچ سکے مگر اس طویل صحرائی سفر میں ہم نے صحرا کے وسط میں ایک ریوڑ چراتے ہوئے چرواہے کو اپنی



آنکھوں سے دیکھا جو تقریباً ایک ہزار سے زائد بکریوں کا اکیلا گلہ بان تھا۔ اس بدُ دگلہ بان (چرہواہے) کو دیکھ کر یقیناً آپ کو قدیم عربوں کے تجارت کے علاوہ واحد پیشے گلہ بانی کا نقشہ سامنے آجاتا ہے اور اس پیشے سے وابستہ پیغمبر آخرالزماں محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے صحابہ کا گلہ بانی کا پیشہ یاد آجاتا ہے۔

اسی طرح شاید اُسی سال مَیں اپنے بیٹے کی کمپنی کے مکہ معظّمہ کے مضافات میں موجود ایک عارضی کیمپ میں رہائش کے دوران جب روزانہ دن کے وقت حرم شریف میں طواف اور عبادت کے لیے آتا تو ایک دن صبح مکہ آتے ہوئے اونٹوں کے ایک بڑے کیمپ کا معائنہ کیا جہاں کھلے میدان میں سینکڑوں کی تعداد میں اونٹ چرائے جاتے اور وہیں پر اونٹ کے گلہ بان خیموں میں رہائش پذیر تھے۔ خیموں کی اسی بستی میں ہم پہلی مرتبہ اُونٹنی کے تازہ دودھ سے بھی لطف اندوز ہوئے۔

تیلی:



ہمارے بچپن کے ابتدائی ایام میں ایک اور پیشہ بھی ہوتا تھا جس کو تیلی کہتے تھے۔ تیلی اپنے کولہو کے ذریعے سرسوں اور تارا میرا کا تیل نکالتے تھے۔ کولہو کیا تھا۔ یہ ایک بیل کی مدد سے چلائی جانے والی وہ مشین ہوتی تھی۔ جس کی مدد سے بیجوں کو ایک خاص قسم کے بیلنے سے پیس کر تیل نکالا

جا تا تھا۔لکڑی کا ایک موٹا بیلنا بیجوں والی لکڑی میں رکھا جا تا وہ بیلنا اتنا بھاری ہوتا کہ اس کو بیل کی مدد سے گھمایا جا تا اس بیلنے کے دباؤ اور اس کی مسلسل رگڑ سے بیجوں سے تیل نچڑ کر آہستہ آہستہ ایک نالی کے ذریعے باہر آتا اور نیچے رکھے گئے ایک برتن میں جمع ہوتا مسلسل دباؤ اور رگڑ سے تیل نکل جاتا اور بغیر تیل کے رہ جانے والے بیج ایک گول برتن کی شکل میں رہ جاتے جس کو تیلی آخر میں نکال لیتے۔ برتن بنے ان پسے ہوئے تیل کے بیجوں کو کھلی کی شکل میں جانوروں کی خوراک کے طور پر کام میں لایا جاتا۔اُس زمانے میں ہمارے علاقے میں صرف سرسوں اور تارہ میرا کا تیل نکالا جاتا یہ دونوں تیل گھریلو ضرورت کھانا پکانے کے لئے استعمال میں لائے جائے۔ جلد ہی تیل نکالنے والی ماڈرن مشینوں کے ایجاد ہونے کی وجہ سے کولھو کا استعمال کم ہو کر آہستہ آہستہ ختم ہو گیا۔اور اس طرح کولھو کا تصور صرف ہماری یادوں میں رہ گیا۔

ماشکی:



ہمارے گاؤں میں دیگر پیشوں لوہار، ترکھان، حجام، جولاہے، میراثی اور موچی کے علاوہ ماشکی کا پیشہ بھی بہت اہم تھا۔ ماشکی کا کام چمڑے کی مشکوں میں نالے سے پانی بھر کر گدھوں پر لاد کر لوگوں کے گھروں میں پڑے ہوئے مٹی کے گھڑوں میں بھرنا ہوتا تھا۔ ماشکی اپنی پانی کی مشکوں سے گھروں میں " گھڑونجی" پر پڑے ہوئے مٹی کے حسبِ ضرورت گھڑے دن میں ایک مرتبہ بھر دیتا اور وہ تمام دن گھر میں پینے اور برتن وغیرہ دھونے میں صرف ہو جاتا۔اسی طرح مسجد کے احاطہ میں بنے ہوئے پانی کے بڑے ٹینک (مَٹ) کو بھی ماشکی مشکوں کے ذریعے لدے ہوئے پانی سے بھر دیتا یہ پانی وضو اور مرد حضرات کے غسل کے کام آتا۔اس کے بدلے میں ماشکی کو سالانہ یا ششماہی کے حساب سے فصلوں سے عوِضانہ ملتا۔

میراثی:

میراثی گاؤں کی فیوڈل اور طبقاتی زندگی کا ایک اہم حصہ ہوتا ہے یعنی جس گاؤں میں چوہدری، خان یا ملک ٹائپ کے زمیندار آباد ہوں وہاں پر میراثی کا ہونا بھی ان کی ضرورت ہوتا ہے۔ میراثی کا



عمومی فرض گاؤں میں ہونے والے شادی بیاہ اور خوشی کی دیگر تقریبات میں ڈھول باجے بجانا ہوتا ہے۔ مجھے یاد ہے میرے ابتدائی بچپن میں میراثی ہمارے گاؤں میں نہیں تھے مگر گاؤں کے خوانین نے رابطہ کر کے فتح جنگ سے ایک میراثی فیملی کو بلوالیا۔انہیں گاؤں میں ایک سادہ سا گھر بھی دلوایا۔ اس میراثی فیملی کا سب سے چھوٹا بیٹا محمد بشیر دوسری جماعت تک میرا ہم جماعت رہا پھر سکول چھوڑ کر اپنے آبائی پیشے سے وابستہ ہوگیا۔شادمانی کے ہر موقعے پر بشیر کا باپ خود شہنائی بجاتا تھا۔اس کا بڑا بھائی ''ترُی''اور بشیر خود ڈھول بجاتا تھا۔گاؤں کی کسی بھی خوشی کے موقع پر اس خاندان کا ِکردار بنیادی ہوتا تھا۔بشیر کی والدہ ''ماسی بختاں'' ایسے موقع پر گھروں میں ڈھولک بجاتی تھی۔اہتمام موسیقی کے علاوہ ان کے ذمے خدمت کے باقی کام بھی ہوتے تھے۔ان کا ذریعہ آمدنی شادیوں میں ڈھول باجے بجاتے وقت ملنے والی ''ویلیں'' ہی ہوتی تھیں اس کے علاوہ زمینداروں کی فصل سے اناج اور سبزیاں وغیرہ بھی حسب مقدار ان کو مل جاتی تھیں۔

گاؤں کے دیگر پیشوں کی طرح میراثی کا پیشہ بھی زوال پذیر ہونے لگا اور مجھے یاد ہے کہ جب میں کالج میں زیرِ تعلیم تھا تو یہ خاندان اپنا پیشہ چھوڑ کر واپس فتح جنگ منتقل ہو چکا تھا۔میرا کلاس فیلو بشیر فتح جنگ میں ٹانگہ چلانے لگا۔ایک مرتبہ پنجاب یونیورسٹی سے چھٹی پر گھر واپس آ رہا تھا، براستہ راولپنڈی فتح جنگ پہنچتے پہنچتے رات ہوگئی۔گھر پہنچنا ضروری تھا۔اڈے پر سواری کے لیے سرگرداں تھا کہ اچانک بشیر نے آواز دی "شاہ جی کدھر" میں نے مُڑ کر دیکھا تو بشیر ٹانگے پر بیٹھا گھوڑے کی لگامیں کھینچ رہا تھا۔میں نے اس کو اپنا مسئلہ بتایا تو وہ فوراً تیار ہو گیا۔اُسے بھی چائے پلائی اور پھر ہم اُس کے ٹانگے پر بیٹھ کر گاؤں کی طرف چل پڑے۔عشاء کا وقت ہو چکا تھا اور ہم گھوڑے کی ٹاپ کی ٹپ ٹپ میں ٹانگے پر بیٹھے ہوئے بچپن کی یادیں بھی تازہ کر رہے تھے اور گاؤں کی طرف رواں دواں بھی تھے۔ٹانگہ تین چار کلومیٹر کا ہموار راستہ طے کر کے کالا چٹا پہاڑ کی چڑھائی چڑھنے لگا۔چاندنی رات تھی اور چاند کی روشنی دن کا سماں پیدا کر رہی تھی مگر کالا چٹا پہاڑ کی چڑھائی چڑھتے ہی جنگل کے درختوں کے سائے مہیب اشکال میں نظر آنے لگے۔اسی لمحے ٹانگہ اچانک رکا اور بشیر کہنے لگا شاہ جی

گھوڑی آگے نہیں جا رہی۔ ٹانگے کی گھوڑی چڑھائی چڑھتے ہوئے تھک گئی یا درختوں کے مہیب سایوں سے ڈر گئی۔ بہرحال میں فوراً ٹانگے سے اترا، بشیر کی جیب میں کرائے کی رقم ڈالی اور اس سے مصافحہ کر کے اپنا چمڑے کا اٹیچی کیس کندھے پر رکھ کر گاؤں تک کا باقی سفر پیدل طے کرنے کے لیے روانہ ہو پڑا۔

کالا چٹا کی چڑھائی پیدل عبور کر کے گھر کیسے پہنچا۔ آدھی رات کو گھر پہنچنے پر اپنی ''بے جی'' کو کتنا پریشان کیا؟ یہ ایک الگ کہانی ہے مگر اپنے بچپن کے دوست بشیر سے اس ملاقات اور ٹانگے کے سفر کا ذکر برسر تذکرہ آ گیا۔ اصل مقصد تو صدیوں سے جاری اس پیشے کا تذکرہ تھا جس نے ہمارے دور میں ہی ختم ہونا تھا۔

پینجا:



پینجا بھی گاؤں کا ایک اہم پیشہ ور تھا جس کا کام نئی اور پرانی روئی کو دُھن کر اسے تازہ کرنا ہوتا تھا۔ پینجا بھی چلتا پھرتا پیشہ ور تھا جو اکثر موسم سرما کے آغاز میں گلی میں نظر آتا۔ اُس کے کندھے پر لکڑی کی ایک بڑی کمان ٹائپ چیز ہوتی تھی جس کے دونوں سِروں پر ایک مضبوط ڈوری بندھی ہوتی تھی۔ پینجا اس ڈوری پر لکڑی کی ایک اور ہتھوڑا نما چیز سے ضرب لگاتا جس سے اس دوڑی میں تھرتھراہٹ Vibration پیدا ہوتی۔ ڈوری کو جب پینجا روئی کے اوپر رکھ کر اس کو ضرب لگاتا تو روئی کے گالے اس تھرتھراہٹ Vibration سے بکھر کر ہوا میں اڑنے لگتے اس طرح سالوں کی جمی اور دبی ہوئی روئی بکھر کر نرم گالوں کی شکل اختیار کر لیتی۔ چنانچہ لحافوں، توشکوں، رضائیوں تکیوں اور گدوں میں جم کر اکٹھی ہو جانے والی روئی ایک مرتبہ پھر نرم ہو جاتی اور نرم ہونے کے ساتھ ہی یہ رضائیاں اور توشکیں زیادہ گرم بھی ہو جاتیں۔ وکی رضائیاں قسم کا نیا کیمیائی روئی کا مواد آ جانے سے روئی کا استعمال اگرچہ کم ہو چکا ہے مگر عام لوگ آج بھی روئی کی ہی رضائیاں استعمال کرتے ہیں تاہم یہاں پر روئی کے پینجے کا کام اب مشین نے لے لیا ہے اور گلیوں میں پھرنے والے پینجے کا پیشہ بھی دیگر پیشوں کی طرح اب تقریباً ختم ہو چکا ہے۔

قلعی گر:

آپ جانتے ہیں کہ ماضی میں دیگر اشیاء کی طرح گھریلو برتن بھی زیادہ تر پیتل اور تانبے کے ہوتے تھے۔اُس وقت چینی کے برتنوں کی ملک کے اندر کوئی صنعت نہ ہونے کی وجہ سے وہ برتن مہنگے پڑتے تھے اس لیے لوگ پیتل، تانبے اور جَست کے برتن استعمال کرتے تھے۔تاہم پیتل اور تانبا مسلسل استعمال ہونے سے میلا ہو کر اس طرح شکل بدل لیتا کہ صرف دھونے سے صاف نہیں ہو سکتا تھا اس لیے اس کو از سرِ نو چمک دینے کے لیے قلعی کروانا پڑتا تھا۔قلعی گر گاؤں کی کسی مخصوص جگہ پر بیٹھ جاتا اور تمام جمع شدہ برتنوں کو ایک مخصوص کیمیائی مادے سے بالکل چمکدار بنا دیتا۔

قلعی کا کام کرنے والے کو قلعی گر کہا جاتا۔قلعی کی ضرورت بھی کہیں سال چھ ماہ کے بعد پڑتی تھی اس لیے اس پیشے کے حامل لوگ بھی تعداد میں کم ہوتے تھے جو پھیری لگا کر کام کرتے۔ بعد میں چینی اور مٹی اور ایلومینیم اور پھر سٹیل کے برتنوں کی صنعت ملک کے اندر قائم ہونے سے تانبے اور اور پیتل کے برتنوں کا استعمال کم ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی ان کو قلعی کرنے والے قلعی گر کا پیشہ بھی زوال پذیر ہو کر آہستہ آہستہ ختم ہو گیا۔

بازیگر (نٹ):

گرمیوں کے کسی پچھلے پہر کو بازیگر گاؤں کے کسی کُھلے چوک میں ڈگڈگی بجا کر اپنی آمد کی اطلاع دے دیتے اور دیکھتے ہی دیکھتے گاؤں کے پہلے بچوں اور پھر بڑوں کا ایک جم غفیر اِن کے گرد جمع ہو جاتا۔اس دوران بازی گر اپنا سامان بانس کے ٹکڑوں پر رسیاں وغیرہ باندھ چکے ہوتے اور پھر لوگوں کے پہنچتے ہی وہ ان رسیوں پر چڑھ کر اپنے کرتب اور بازی گری دکھانا شروع کر دیتے۔پھر ان بازی گروں کا جب گاؤں کی طرف آنا کم ہو گیا تو پتہ چلا کہ بڑے قصبوں میں منعقد ہونے والے میلوں ٹھیلوں میں یہی بازیگر سرکس قائم کر کے اپنا کام دکھا رہے ہوتے اور بازیگری کا فن دکھانے والے ''نٹ'' اب سرکس کے اندر کام کر کے ''فنکار'' کہلانے لگے۔

جھگیوں والے:

موسم سرما شروع ہوتے ہی گاؤں کے ساتھ ہی کسی بھی کھلے کھیت میں اچانک خیموں کا ایک گاؤں بس جاتا اور ہم بچے یہ سن کر نہال ہو جاتے کہ جھگیوں والے آ گئے ہیں۔اگلے دن شام کو ان کی عورتیں ''گُھگو

گھوڑے لے لو' کی صدائیں لگاتی ہوئی گلیوں میں پہنچ جاتیں۔ان عورتوں کے پاس عموماً مٹی سے بنے ہوئے جانوروں کے مجسمے اور کچھ منہ سے بجانے والے آلات موسیقی ہوتے جو یہ لوگ گندم یا آٹے کے بدلے میں فروخت کرتے۔ان اشیاء کے زیادہ تر خریدار بچے ہی ہوتے۔ یہ جھگیوں والے چند روز ایک ہی گاؤں میں گزار کر اگلے گاؤں کو سدھار جاتے اور پھر ہم اگلے سال تک ان کا انتظار کرتے۔

سپیرے:



سپیرا بھی گاؤں میں تفریح کا ایک ذریعہ ہوتا۔سپیرا عموماً اکیلا ہوتا اور اپنی "پٹوری" اور بین کے ساتھ اچانک نظر آجاتا۔گلی میں جہاں کہیں بھی دو چار لوگ نظر آتے یہ اپنی پٹوری رکھ کر بین بجانا شروع کر دیتا۔لوگوں کے جمع ہونے پر وہ پٹوری کا سر ہٹا دیتا اور اس میں سے ایک بڑا ناگ (کوبرا) آہستہ آہستہ سر اٹھانے لگتا۔ بین کی مسلسل آواز کے ساتھ کوبرا اپنے پھن کو پھیلا کر کھڑا ہو جاتا۔اس دوران سپرا اسے چھیڑتا اور وہ کئی مرتبہ اس کو ڈسنے کی کوشش کرتا۔تماشائیوں کی تعداد اور استعداد دیکھ کر بعض اوقات سپیرا اس ناگ سے ڈسوا کر اپنے پاس موجود ایک "امان (پتھر نما چیز)" سے زہر آلود خون چسوا لیتا۔ دیہاتی سانپ اور سپیرے کے ان کمالات کو دیکھ کر حیرانی اور خوف کی کیفیت میں مبتلا رہتے اور اکثر اس سے سانپ کے ڈسے ہوئے زہر آلود خون کو چوسنے والی چیز خرید لیتے۔ یہ "اکسیر" آئٹیم آئندہ کے لیے کارگر ہوتا یا نہ،مگر خریدنے والا اپنے آپ کو آئندہ کے لئے کوبرے کے ڈسنے اور اس کا علاج موجود ہونے سے محفوظ سمجھتا۔اور باقی لوگ صرف سپیرے کا تماشا دیکھ کر محظوظ ہوتے۔

بندر اور بھالو (ریچھ) والا:

بندر اور بھالو والے بھی عموماً جھگیوں والوں میں سے ہی ہوتے مگر اکثر اوقات وہ اکیلے بھی آ

جاتے۔ اکثر کے پاس تو بندر ہوتے مگر چند ایک کے پاس بھالو بھی ہوتے۔ یہ بھی موسم گرما کی فصل کی کٹائی کے موسم میں آتے اور گلی کی کسی کھلی جگہ بیٹھ کر ڈگڈگی بجانا شروع کر دیتے۔ لوگوں کے جمع ہو جانے کے بعد وہ بندروں اور ریچھ سے مختلف کرتب کرواتے۔ بندر اور ریچھ کی شکل ہی ایسی ہوتی جس کی دیکھ کر ہی بچے محظوظ ہوتے، یہ بھی جھگی والوں کی طرح خانہ بدوش ہوتے۔ بندرار ور یچھ (بھالو) پالنے والے آج بھی میلے ٹھیلے والی جگہوں پر مل جاتے ہیں۔



(بچپن کی یادوں سے وابستہ ایک خوبصورت گانا جو آج بھی اپنی آواز اور سُروں کے ساتھ کانوں میں رس گھول دیتا ہے۔)

وہ کاغذ کی کشتی وہ بارش کا پانی

یہ دولت بھی لے لو، یہ شہرت بھی لے لو
بھلے چھین لو مجھ سے میری جوانی
مگر مجھ کو لوٹا دو وہ بچپن کا ساون
وہ کاغذ کی کشتی، وہ بارش کا پانی

محلے کی سب سے پرانی نشانی
وہ بڑھیا جسے بچے کہتے تھے نانی
وہ نانی کی باتوں میں پریوں کا ڈیرا
وہ چہرے کی جُھریوں میں صدیوں کا پھیرا

بھلائے نہیں بھول سکتا ہے کوئی
وہ چھوٹی سی راتیں وہ لمبی کہانی

کڑی دھوپ میں اپنے گھر سے نکلنا
وہ چڑیاں وہ بلبل وہ تتلی پکڑنا
وہ گڑیا کی شادی میں لڑنا جھگڑنا
وہ جھولوں سے گر نا وہ گر کے سنبھلنا
وہ پیتل کے چھلوں کے پیارے سے تحفے
وہ ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کی نشانی

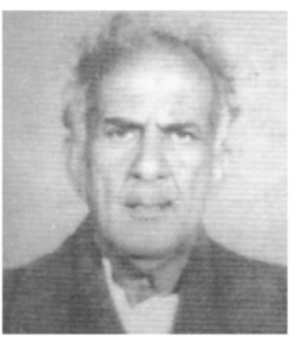
کبھی ریت کے اونچے ٹیلوں پہ جانا
گھروندے بنانا بنا کر مٹانا
وہ معصوم چاہت کی تصویر اپنی
وہ خوابوں خیالوں کی جاگیر اپنی
نہ دنیا کا غم تھا نہ رشتوں کا بندھن
بڑی خوبصورت تھی وہ زندگانی

میری ابتدائی تعلیم

میری ابتدائی تعلیم والے سکول کا سرکاری نام گورنمنٹ پرائمری سکول گکھڑ ضلع اٹک (اس وقت ضلع کیمبلپور) تھا جو طلباء و طالبات کے لئے ایک ہی سکول تھا جیسا کہ پہلے بتا چکا ہوں میں گھر میں اپنی والدہ محترمہ سے ناظرہ قرآن اور کچی جماعت کا قاعدہ پڑھ چکا تھا اس لئے مجھے صرف چھ دن بعد ہی پکی (پہلی جماعت) میں ترقی دے دی گئی اور مجھے یاد ہے کہ میرے والد بزرگوار مجھے پہلے دن سکول لے گئے اور انہوں نے ہی مجھے سکول میں داخل کروایا تھا۔



سید لعل شاہ مرحوم سکول کے ہیڈ ماسٹر تھے اور منشی وارث خان سینئر ٹیچر تھے بعد میں ایک ٹیچر مولوی الطاف حسین بھی آ گئے اور کچھ اساتذہ مولوی سکندر خان اور مولوی مولا داد بھی مختصر عرصہ کے لئے تبدیل ہو کر گکھڑ آئے (یاد رہے کہ ہیڈ ماسٹر کو ہم شاہ جی اور وارث خان کو منشی جی اور باقی اساتذہ کو مولوی یا مولی جی کہتے تھے اور یہ القابات یا طلبہ کے رکھے گئے نام کم و بیش ہائی سکول میں بھی چل رہے تھے۔



منشی وارث خان

سید لعل شاہ مرحوم اور منشی وارث خان مرحوم میری پوری ابتدائی تعلیم میں پرائمری سکول میں موجود رہے۔ میری ابتدائی تعلیم اور ذہن سازی میں

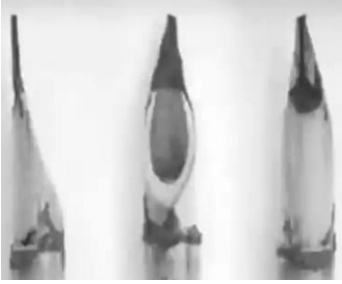
سب سے اہم کردار منشی وارث خان کا ہے۔



اُس زمانے میں پرائمری سکول میں مضمون کے استاد (subjict teacher) کی بجائے کلاس ٹیچر ہوا کرتے تھے جو ایک کلاس کو تقریباً تمام مضامین پڑھاتے تھے منشی وارث خان ہمارے پہلی جماعت اور پھر چوتھی اور پانچویں جماعت کے کلاس ٹیچر تھے اور ان کا انداز تدریس بھی سب سے اعلیٰ تھا چونکہ ذریعہ تعلیم اردو تھا اس لئے معاشرتی علوم، ریاضی اور اسلامیات سب اُردو میں پڑھائے جاتے تھے۔ لہٰذا ہماری اُردو شروع سے ہی بہتر تھی اور مضامین کم ہونے کی وجہ سے ان مضامین میں مہارت پر توجہ زیادہ مرکوز رہتی تھی۔

دوسری اور تیسری جماعت میں مولوی الطاف حسین خود بھی اُردو کے خوش نویس استاد تھے اور ہم پر بھی زیادہ توجہ دیتے تھے لکھائی پر لکڑی کی تختی قلم اور دوات تین چیزیں ہی ہوتی تھیں۔ چوتھی کوئی چیز نہیں تھی لکھائی کے لئے طریقہ کار، طریقہ تدریس اور طریقہ تعلیم یہ تھے کہ لکڑی کی تختی ہم گھر سے دھو کر لاتے اور اس پر گاچی (سفید مٹی) گیلی کر کے دونوں طرف مَل لیتے اور دھوپ میں رکھ کر سکھا لیتے ہوم ورک عموماً لکھائی کا کام ہی ہوتا تھا جو ایک تختی دونوں طرف سے لکھ کر لانا ہوتا تھا اور سکول میں بھی ایک مرتبہ تختی لکھ کر استاد کو دکھانا روزمرہ کا معمول ہوتا۔ اس طرح لکھنے میں مہارت اور خوش خطی دونوں کی تربیت اس ذریعے سے ہو رہی تھی میں نے آپ کو بتایا کہ ہماری لکھائی کی تربیت تختی پر ہی ہوتی تختی عموماً شیشم کی لکڑی کا ایک ڈیڑھ فٹ لمبا اور آٹھ یا دس انچ چوڑا اور نصف انچ موٹا تختہ ہوتا تھا جس کے ایک سرے پر 4 یا 5 انچ کا ایک مخمس شکل کا کونہ ہوتا جو تختی کو ایک ہاتھ سے پکڑنے کے کام آتا۔ سکول میں تختی دھونے کے لئے ایک جگہ پانی کا انتظام ہوتا جہاں تقریباً سب طلبہ سیاہ پانی والے ایک ہی ٹب میں تختیاں دھو کر کام چلا لیتے۔

لکھنے کے لئے قلم سرکنڈے (کانے) کو ایک طرف سے چاقو سے ترچھا کاٹ کر قلم کی نوک بنائی جاتی۔ ہمارے استادِ محترم مولوی الطاف کے پاس عموماً ایک جیبی چاقو موجود ہوتا جس سے وہ ہمارے لیے سرکنڈے یا نڑی کے ٹکڑے سے قلم بناتے چونکہ وہ خود خوشنویس تھے اس لئے قلم بنانے میں بھی



مہارت رکھتے تھے اور شاگردوں کے لئے قلم بنانے کی یہ خدمت وہ رضا کارانہ اور خوش دلی سے سرانجام دیتے تھے۔ ہم عموماً ایک سرکنڈے یا نڑی کو اس وقت تک کاٹ کاٹ کر قلم کی نوک تازہ کرتے رہتے جب تک وہ کم ہو کر ایک ہاتھ کی لمبائی سے بہت کم نہ ہو جاتا۔ رہ گئی دوات تو مجھے یاد ہے کہ میں نے پتھر کی بنی ہوئی دواتیں بھی دیکھیں مگر بہت کم، ہم کسی کھلے منہ والی شیشے یا ڈھکنے والی بوتل میں سیاہی گھول کر اس میں ایک کپڑے کا ٹکڑا بھی ڈال دیتے جو ہر وقت سیاہی میں بھیگا رہتا اور جب قلم دوات میں ڈالتے تو سیاہی کی ایک مناسب مقدار قلم کی نوک پر لگتی جو تختی پر لکھتے وقت اس سیاہی کو پھیلنے اور بے قابو ہونے سے روکتی۔ کپڑے کا یہ گیلا ٹکڑا قلم کو بار بار دوات میں ڈالنے سے اس کی نوک کو ٹوٹنے یا ٹیڑھا ہونے سے بچاتا تھا۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ ابتدائی ایک دو سالوں میں بہت ہی دیسی (گھریلو) قسم کی سیاہی ملتی تھی جو گھول کر دوات میں ڈالتے مگر جلد ہی یعنی دوسری، تیسری جماعت میں ہمیں پنجاب کے ایک شہر لالہ موسیٰ کی بنی ہوئی پُڑیا میں بند سیاہی دستیاب ہونے لگی جو کوالٹی میں بہت اعلیٰ اور سیاہ چمکدار ہوتی اور تحریر کو خوبصورت بناتی تھی دو پیسے یعنی ایک ٹکے کی پُڑیا کئی دنوں تک چل سکتی تھی۔ تیار سیاہی جو (فاؤنٹیں) پین میں آج بھی بھری جاتی ہے اور مختلف کمپنیوں کی تیار کردہ دستیاب ہیں وہ ہم نے بہت بعد میں یعنی ہائی سکول میں جا کر استعمال کرنا شروع کی۔ اسی طرح ہولڈر یا پین سے لکھنا تو بہت بعد کی بات ہے۔ جو جماعت ششم سے شروع ہوئی۔ انگریزی کی تحریر سیکھنے کے لئے (جی G) کی نب اور اُردو کی تحریر کے لیے (زیڈ Z) کی نب ہولڈر میں استعمال ہونے لگیں۔

ابھی تو ابتدائی تعلیم کی بات ہو رہی ہے۔ مولوی الطاف صاحب ہماری اردو کی لکھائی کو پکا کرنے کے لئے تختیوں کی لکھائی کے مقابلے کرواتے۔ عموماً تفریح (Recess) کے بعد یہ مقابلہ شروع ہوتا۔ جو طالب علم ایک مقررہ تعداد میں تختیاں لکھ کر ختم کر لیتا اس کو ساری چھٹی کا انعام مل جاتا۔ لکھائی کے علاوہ ریاضی (حساب) کے سیکھنے کے لئے سلیٹ کا استعمال کیا جاتا تھا۔ سلیٹ شروع میں مٹی کی پلیٹوں سے بنائی جاتی جو تھوڑے استعمال کے بعد اکثر ٹوٹ جاتی تھیں مگر اسی دور میں ٹین کی پلیٹ سے بنی ہوئی پینٹ شدہ سلیٹیں استعمال ہونے لگیں جو پائیدار ہونے کے علاوہ لکھائی میں بھی آساں، ہلکی اور جلد صاف ہو جاتی تھیں۔ سلیٹ

پر لکھنے کے لئے چاک نما سلیٹی استعمال ہوتی تھی جو ایک نرم پتھر سے بنی ہوتی تھیں۔ سلیٹی سے لکھی گئی لکھائی (ریاضی کے سوالات) جلد صاف ہوجاتے تھے مگر اس کے لئے پانی کی بجائے تھوک سے کام چلالیا جاتا تھا۔ زیادہ نفاست کے لئے سلیٹ کے ساتھ کپڑے یا فوم کا ایک گیلا ٹکڑا باندھ دیا جاتا جس کے ایک دفعہ پھیرنے سے سلیٹ صاف ہوجاتی۔ کچی جماعت میں اردو میں صرف اردو حروف تہجی لکھنا اور پڑھنا سیکھنا پڑتا تھا اور کچی (نرسری) میں حساب یا ریاضی کا جھنجھٹ نہیں ہوتا تھا البتہ پہلی (پکی) میں قاعدے میں ابتدائی جوڑ سیکھنے کے علاوہ مختصر مگر سادہ جملے بھی شامل تھے اور کتاب کے آخری صفحے پر ایک نظم بھی شامل تھی جو مجھے آج بھی یاد ہے آپ بھی سن لیں۔

ہم پاکستانی بچے ہیں۔۔سب باتوں میں ہم سچے ہیں
آزاد وطن میں رہتے ہیں۔۔آباد وطن میں رہتے ہیں
یہ پاکستان ہمارا ہے۔۔دل وجان سے ہم کو پیارا ہے
ہم پاکستانی بچے ہیں



دوسری جماعت کی اُردو میں چھوٹے چھوٹے باتصویر مضامین اور چند نظمیں شامل تھیں اور ریاضی میں سادہ جمع، تفریق (منفی) کے سوالات سلیبس میں شامل تھے۔ جماعت سوم میں اُردو کی زیادہ ذخیرہ الفاظ کے ساتھ تھوڑی اضافی ضخامت کی کتاب شامل تھی اس کو اضافی کتاب کہتے تھے جس میں مشقی سوالات بھی شامل ہوتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ تیسری کلاس کی ابتداء میں ہی ہم نے اردو اسباق کو خود پڑھنے کی کوشش شروع کردی اور اُردو کی کتاب کو ہم بغیر استاد کی مدد کے پڑھنے لگے اور چوتھی کلاس تک تو نئے ذخیرہ الفاظ کے معنی نہ جانتے ہوئے بھی ہم ان کو صحیح تلفظ

کے ساتھ پڑھ سکتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ ان دنوں ذریعہ تعلیم (میڈیم) تمام مضامین کے لئے اردو ہی تھا اور اس کی برکت سے ہم اردو زبان میں آج کے طلبہ کی نسبت کئی گنا بہتر مہارت رکھتے تھے۔

رسالہ بچوں کی دنیا:

ایک اور اچھی بات یہ ہوئی کہ چوتھی جماعت میں میرے بڑے بھائی سید قربان حسین شاہ نے بچوں کا مشہور ماہوار رسالہ ''بچوں کی دنیا'' جو لاہور سے جاری ہوتا تھا اور غالباً آج تک جاری ہے، میرے نام جاری کروا دیا۔ ہر ماہ جب نیا رسالہ آتا تو میری خوشی کا ٹھکانہ نہیں ہوتا تھا۔ رسالے میں کہانیوں کے علاوہ نظمیں، لطائف، خاکے اور قلمی دوستی کے کالم ہوتے تھے جن کو ہم نہ صرف شوق سے پڑھتے بلکہ قلمی دوستی کے حوالے سے کسی حد تک لکھنے بھی لگ گئے۔ میرا نہ صرف یہ خیال ہے بلکہ یقین کامل ہے کہ ادب (لٹریچر) کا ذوق جو کسی حد تک بعد میں جاری رہا اور آج تک جاری ہے اُس میں اور عوامل کے علاوہ رسالہ ''بچوں کی دنیا'' کے مطالعے کا بھی اثر ہے۔

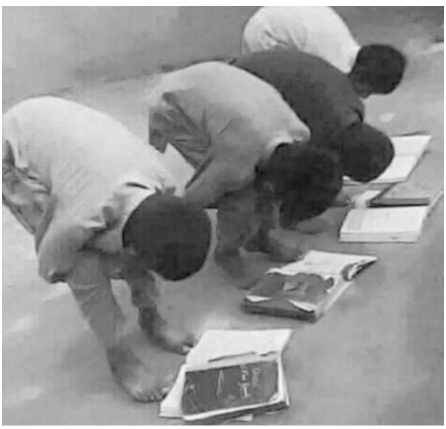
ناظرہ قرآن:

اس دوران پہلے بغدادی قاعدہ اور پھر ناظرہ قرآن مجید کی تعلیم گھر پر جاری رہی۔ میری پہلی استاد میری والدہ محترمہ گھر میں باقی بچوں کے ساتھ قرآن کی ناظرہ کی تعلیم دیتیں۔ یہ تعلیم عموماً صبح سویرے ناشتے کے بعد شروع ہو جاتی۔ سکول جانے والے بچے گھنٹہ ڈیڑھ کے بعد چھٹی کر کے سکول روانہ ہو جاتے اور باقی بچے بیٹھ کر قرآن پڑھتے۔ میں چوتھی جماعت میں تھا کہ میں نے ناظرہ قرآن کریم مکمل کر لیا۔ اس کے بعد مجھے یاد ہے کہ سردیوں کے موسم میں کچھ دنوں کے لئے والد مرحوم نے مجھے قرآن مجید کا ترجمہ پڑھانا شروع کر دیا۔ یہ ترجمہ عربی زبان سے براہ راست ہندکو زبان میں پڑھایا جاتا۔ ایک دن پڑھاتے اور اگلے دن اسی کو لفظ بہ لفظ سنانا پڑتا تھا۔ پھر اچانک یوں ہوا کہ والد محترم کہیں طویل دورے پر باہر چلے گئے۔ اور میرا ترجمہ قرآن کا درس ادھر ہی رہ گیا۔

ترجمہ قرآن کا یہ سلسلہ دوبارہ اس لئے نہ جڑ سکا کہ پانچویں کا امتحان پاس کرنے کے بعد مجھے چھٹی کلاس کے لئے گورنمنٹ ہائی سکول باہتر (ضلع اٹک) داخل ہونا پڑا جو ہم عموماً اندھیرے منہ گھر سے نکل کر

پانچ، چھ کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے ہائی سکول پہنچتے لہذا صبح کی والدہ محترمہ کی گھر کی اکیڈمی دوبارہ نہ چل سکی۔

بات مَیں ابتدائی تعلیم کی کر رہا تھا کہ دوسری، تیسری جماعت میں تختیوں پر لکھائی کی مشق اور اردو کے ساتھ ساتھ دینیات اور معاشرتی علوم کی کتب پڑھنے سے پڑھائی اور لکھائی دونوں میں ہم طاق ہو گئے۔ چوتھی، پانچویں میں منشی وارث خان مرحوم نے دوبارہ ہمیں (ہماری کلاس کو) اپنی تحویل میں لے لیا اور اب ہم اپنے سکول کے سینئر طلبہ میں شمار ہونے لگے اس دوران کسی استاد کی غیر حاضری یا عدم موجودگی میں ہم چھوٹی کلاسوں کی نگرانی پر بھی مامور ہو جاتے اپنی کلاسوں میں مجھے کئی مرتبہ کلاس مانیٹر بننے کا شرف بھی حاصل رہا۔ چوتھی اور پانچویں جماعت میں ہی اردو، دینیات اور معاشرتی علوم کی کتب پڑھنے کے ساتھ پہلی مرتبہ ہم سے کاپیاں (نوٹ بکس) بھی تیار کروائی گئیں۔ مگر ریاضی کا کام بدستور سلیٹ پر ہی کروایا جاتا۔ ریاضی میں استاد محترم منشی وارث خان کو مکمل عبور حاصل تھا مشق کے سوالات تھوڑی دیر تختہ سیاہ پر کرواتے اور پھر سلیٹ پر ہماری مشق شروع ہو جاتی۔ ایک کے بعد دوسرا سوال اور پھر تیسرا، یہاں تک کہ پوری مشق ایک دن میں ختم ہو جاتی۔



ہر سوال ہم سلیٹ پر حل کر کے یا تو استاد کو فوراً دکھاتے یا سب طلبہ سلیٹ پر سوال حل کر کے سلیٹ کو اُلٹا کر کے رکھ دیتے اور استاد صاحب ایک ہی وقت میں حل شدہ سوالات کے جواب دیکھ لیتے۔ پوری کلاس میں عموماً ایک دو طلبہ ایسے ہوتے جو آخر تک سوال حل نہ کر سکتے تو ان کو اُستاد صاحبان کی طرف سے تھپڑوں کی سزا کا سامنا کرنا پڑتا اور بسا اوقات طویل وقت کے لئے مرغا بھی بننا پڑتا مرغا بننے کی سزا عموماً شرارت یا کسی بڑی غلطی پر ملتی اور چھوٹی غلطیوں (تعلیمی غلطیوں) پر تھپڑ کی سزا کو کافی سمجھا جاتا۔

اب یہ استاد کے پٹھوں اور ہاتھ اور بازوؤں کی مضبوطی پر منحصر ہوتا کہ سزا کی شدت کیا ہوتی۔

شعر بازی:

ایک قابل ذکر بات یہ بھی ہے کہ چوتھی، پانچویں جماعت میں لطیفے سنانے کے علاوہ مشاعرے (شعر بازی) کے مقابلے بھی کروائے جاتے۔ طریقہ یہ تھا کہ چوتھی اور پانچویں جماعت کے مقابلے کا تعین ہوتا اور تاریخ مقرر ہو جاتی۔ دونوں طرف کے طلبہ ذخیرہ اشعار اکٹھا کرنے میں لگ جاتے۔ شعر بازی کے مقابلے والے دن استاد صاحب ایک شعر پڑھتے اور ایک جماعت کے طالب علم کو دعوت دی جاتی کہ وہ اس کے بعد ایسا شعر پڑھیں جس کا پہلا حرف اس حرف سے شروع ہو جس پر پہلا شعر ختم ہوتا ہو پہلا شعر کوئی بھی مثلاً

مئی کا آن پہنچا ہے مہینہ
بہا چوٹی سے ایڑی تک پسینہ

اگلا شعر وہ پڑھا جاتا جو ''ہ'' سے شروع ہوتا اس قسم کے مشاعرے بعد میں ستر، اسی اور نوے کی دہائی میں پاکستان ٹیلی وژن کے سدا بہار کمپیئر طارق عزیز مرحوم اپنے پروگرام نیلام گھر میں بھی کرواتے تھے اور ہم باقی پروگرام کے علاوہ اس میں دلچسپی لیتے اور گھر بیٹھے ٹی وی میں شریک رہتے۔

مشاعرہ اکثر چوتھی اور پانچویں جماعت کے طلبہ کے درمیان ہوتا۔ راقم اپنی کلاس کو لیڈ کرتا اور اکثر مقابلہ ہم جیت جاتے کچھ عرصہ بعد شعر بازی کے مقابلوں میں Tactes استعمال ہونے لگے کسی نے شعر ڈھونڈ نکالا

؎ ایک لڑکا پڑھ رہا تھا یہ کتاب۔۔۔۔۔الغیاثُ ولغیاثُ ولغیاث

اب یہ شعر تو معیاری نہیں تھا مگر شعر تو تھا اس کے جواب میں ث کے حرف سے شروع ہونے والے اشعار ہمارے ذخیرہ اشعار میں موجود نہ تھے نتیجتاً جس نے یہ شعر پڑھ لیا اس نے مقابلہ جیت لیا آخر کار ہمارے محترم ہیڈ ماسٹر صاحب سید لعل شاہ مرحوم ہمارے لیے اس شعر کا جوابی توڑ بھی ڈھونڈ نکال لائے اور وہ شعر تھا

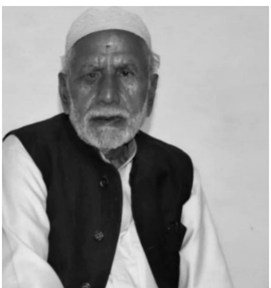
؎ ثابت رہا میں آج تلک اپنے قول پر۔۔۔۔اقرار کر کے آپ میری جان نکل گئے

اس شعر کے آجانے کے بعد مقابلوں میں دوبارہ جان پیدا ہوگئی اور شعر بازی کے مقابلے قدرے زیادہ دیر تک چلنے لگے۔

سینٹر کا امتحان:


محمد گلزار

پانچویں کا امتحان ایک قسم بورڈ کا امتحان ہوتا جسے ہم سینٹر کا امتحان کہتے۔ یہ امتحان پانچویں کا سال ختم ہونے پر ہم گورنمنٹ پرائمری سکول باہتر جا کر دیتے تھے جس میں اردگرد کے تقریباً آٹھ دس دیہات کے سکول شامل ہوتے۔ پرائمری سکول باہتر کے ہیڈ ماسٹر اس کے انچارج ہوتے اور علاقے کے سینئر پرائمری اساتذہ اس کو منعقد کروانے میں شامل ہوتے۔ ہم بھی پرائمری کا امتحان دینے 5 کلومیٹر چل کر باہتر گئے۔ پانچویں میں ہم کل دس طلبہ تھے۔ سب لڑکے تھے غالباً ایک کے علاوہ سارے پاس ہو گئے تھے میرے کلاس فیلوز (ہم جماعت) طلباء میں میرے علاوہ عبدالمجید، عبدالجلیل، محمد گلزار، بشارت خان، محمد یونس، اور ڈھوک بلوچ کے غلام صفدر، کرم داد، محمد صادق اور محمد رفیق شامل تھے۔ ان میں سے کچھ تو فیل ہو کر پچھلی کلاس میں رہ گئے اور عبدالمجید اور ایک دوسرا لڑکا آٹھویں کا بورڈ امتحان میرے ساتھ پاس کر سکے۔


عبدالجلیل


بشارت خان

آٹھویں کا بورڈ امتحان:

یاد رہے کہ اس وقت آٹھویں کا بورڈ امتحان لاہور کے رجسٹرار محکمہ تعلیم کی ذمہ داری تھی پیپرز بھی وہیں سے آتے اور نتائج بھی ادھر ہی تیار ہوتے اور پورے صوبہ پنجاب کے لئے ایک ہی رجسٹرار محکمہ تعلیم ہوتا۔ میرے پاس لاہور کے رجسٹرار محکمانہ امتحانات کا آٹھویں جماعت کا سرٹیفیکیٹ آج بھی موجود ہے۔ ہمارا پرائمری سکول جو بہت ہی قدیم سکول تھا اس کی قدامت کا اندازہ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ ہمارے موضع لنگر کے رشتے کے ماموں سید نظیر حسین شاہ اور سید سلطان شاہ (مرحومین) بھی اسی سکول میں زیر تعلیم رہے کیونکہ موضع لنگر میں اس وقت پرائمری سکول نہیں تھا یہ دو ماموں صاحبان مجھ سے عمر میں پچیس تیس سال بڑے ہونگے۔

ہمارا پرائمری سکول:

ہمارے وقت میں ہمارے گاؤں کے جنوبی حصے میں ایک ہندو مندر (دھرم شالہ) میں ہمارا سکول واقع تھا جو ہندوؤں کے ترک وطن کر جانے کے بعد خالی ہوگیا تھا اس میں کل 2 پکے کمرے تھے اور ایک کچا کمرہ ہوتا تھا۔ دو دو کلاسیں ایک ایک کمرے میں اور ایک کلاس صحن میں موجود بیری کے درخت کے نیچے بیٹھ جاتی اور درخت کے سائے ساتھ ساتھ اکثر جماعت (طلبہ) بھی اپنی جگہ بدلتی رہتی بعدازاں ہمارے والد مرحوم نے جو (صدر ایوب مرحوم کے دور میں) بی ڈی ممبر تھے، نے اپنے فنڈ سے ایک اور کمرہ تعمیر کروایا جو غالباً میرے سکول سے پانچویں پاس کرنے کے بعد سن ساٹھ کے ابتدائی سالوں میں تعمیر ہوا اور پھر طویل مدت کے بعد پرائمری سکول کو اپ گریڈ کر کے مڈل سکول کا درجہ دیا گیا جو ابھی تک مڈل ہی ہے مگر اب گاؤں کے باہر اس کو اپنی عمارت نصیب ہو چکی ہے۔ پرائمری سکول ہمارے گھر سے کچھ فاصلے پر تھا۔ صبح جاتے وقت تو وقت پر حاضری کے ڈر سے ہم سیدھے سکول جاتے گھر واپسی پر پورے گاؤں سے گزر کر آتے۔ واپسی پر ہمارا پہلا پڑاؤ گاؤں کی جنوبی مسجد (نائیاں والی) میں تھوڑا قیام ہوتا۔ مسجد کے پچھواڑے کی دیوار جس میں محراب غالباً باہر کو نکلا ہوتا تھا اور یہ چونے سے پختہ اور پلستر شدہ تھا۔ اُس وقت یہی ایک عمارت ہموار پلستر شدہ تھی جس کو رک کر چومنا ہم باعث ثواب اور ضروری سمجھتے تھے مسجد کے باہر ہاتھ سے لکھی ہوئی خوبصورت تحریر میں کسی نے یہ شعر لکھ دیا تھا

نہ مسجد میں، نہ مندر میں، نہ بیت اللہ کی دیواروں کے سائے میں
نمازِ عشق ادا ہوتی ہے تلواروں کے سائے میں

یہ شعر روزانہ پڑھتے اور اس کا ورد کرنے سے ہمیں از بر ہو گیا مسجد سے آگے چل کر ہندو مندر کی ایک اور عمارت آتی تھی یہ بھی غالباً کسی متمول ہندو کی رہائش گاہ یا عبادت گاہ تھی۔ بڑے کہتے تھے یہاں ہندوؤں کے دور میں باقاعدہ ایک چھوٹا بازار ہوتا تھا جس کا اب نام ونشان بھی نہیں رہ گیا تھا۔ اس عمارت کی چھت گر چکی تھی اور شرقاً غرباً اونچی دیوار موجود تھی۔ گرمیوں میں اس دیوار کا سایہ کافی وسیع اور دیر تک رہتا عموماً گرمیوں میں ہم اپنی تختیاں اور بستے اس دیوار میں لٹکا کر تھوڑی دیر کے لئے اس کے سائے میں ستا لیتے اور ایک دوسرے کے

ساتھ چھوٹی موٹی شرارتیں بھی اس جگہ کر لیتے ۔ یہ تھے ہمارے سکول کے حالات وواقعات اور ہمارے معمولات یہاں تک کہ ہم پرائمری (پنجم جماعت) کا امتحان پاس کر کے چھٹی جماعت میں گورنمنٹ ہائی سکول باہتر میں داخل ہو گئے اور اس طرح ہماری ابتدائی تعلیم کا ایک دور ختم ہو کر دوسرے دور کا آغاز ہو گیا۔

میری ثانوی تعلیم (گورنمنٹ ہائی سکول باہتر ضلع کیملپور (ضلع اٹک)

پرائمری (جماعت پنجم) کا امتحان پاس کرنے کے بعد والد بزرگوار ہمیں ہائی سکول باہتر لے گئے جس کو چند سال قبل ہی (1956ء) میں مڈل سے اپ گریڈ کر کے ہائی کا درجہ دیا گیا تھا پنجاب میں پرائمری اور ثانوی تعلیم کا شعبہ اس وقت ڈسٹرکٹ بورڈ کے ماتحت تھا اس لئے اس سکول کو ڈی ۔ بی ہائی سکول باہتر کہا جانے لگا ہائی سکول کے بانی سید رحم دریا شاہ مرحوم ہیں۔



سید رحم دریا شاہ

جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ اس پورے علاقہ نلہ میں ایک ہی مڈل سکول تھا اور ارد گرد کے قریباً پچاس سکولوں کے بچے مڈل آٹھویں کا امتحان پاس کر کے تعلیم ترک کرنے پر مجبور ہو جاتے ۔ چنانچہ اللہ کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے ایک ایسی شخصیت جنہوں نے اس سکول کو ہائی (دہم) کا درجہ دلوا کر اس علاقے کی نسلوں کی قسمت بدل کر رکھ دی۔ اس زمانے میں ڈسٹرکٹ بورڈز کی طرف سے کوئی ایسی پیشکش ہوئی کہ جو مڈل سکول اپ گریڈ ہونا چاہتے ہیں وہ اخراجات پر اٹھنے والی کل رقم کا کچھ فیصد جمع کرا دیں تو ان کا سکول اپ گریڈ کر دیا جائیگا۔ سید رحم دریا شاہ اسی سکول میں ایس-وی ٹیچر تھے- باہتر کے قریبی ایک دیہات زیندی کے معزز سید خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ خوبصورت شکل اور وجیہہ قد کاٹھ کے انسان تھے۔ موضع باہتر کے ہی ایک معزز کھٹڑ خاندان کے داماد بن جانے سے ان کی دنیاوی وجاہت میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ بہر حال سکول کو ہائی کا درجہ دینے کے لئے حکومتی پیشکش کو پورا کرنے کے لیے انہوں نے لبیک کہا اور پورے علاقے سے چندہ کر کے رقم جمع کرنے کے لیے ایک مہم کا آغاز کر دیا، وہ ہر روز سکول سے چھٹی کر کے اسی سکول کے چند طالب علموں کو لے کر ایک ایک گاؤں جاتے اور چندہ (اُگاہ) کر شام کو واپس

گھر آ جاتے۔اسی طرح چند ماہ کے اندر انہوں نے مطلوبہ رقم عوامی چندے سے جمع کر کے سرکار کے خزانے میں جمع کرادی اور اُسی سکول کو ہائی تک کا درجہ دے دیا گیا۔سید رحم دریا شاہ نے جنہیں عام طور پرشاہ رحم کہا جاتا تھا ایک ایسا کام کر دیا جس نے آنے والی نسلوں کی قسمت بدل کرر کھ دی۔سکول کا ایک عام استاد ہوتے ہوئے انہوں نے ایک ایسا کام کر دیا جس کو علاقے کے عوام کی طرف سے **سر سید اٹک** کا خطاب دیا گیا۔بے شک جن لوگوں نے تعلیم کی ترقی کے لئے اپنے آپ کو وقف کیا انہوں نے اس دنیا کے ساتھ ساتھ اپنی آخرت بھی سنوار لی۔

ہمارے والد صاحب میرے علاوہ گاؤں کے چند اور بچوں کو بھی ہمراہ لے گئے کیونکہ ان کے والدین ان پڑھ ہونے یا کسی اور معذوری کی وجہ سے خود نہیں جا سکتے تھے ان میں سے عبدالمجید اور عبدالجلیل کے نام مجھے آج تک یاد ہیں اور یہ دونوں بحیات ہیں۔اس طرح جماعت پنجم میں پاس ہونے والے ڈھوک بلوچ کے کرم داد، محمد رفیق اور غلام صفدر خان بھی ہمارے ساتھ جماعت ششم میں داخل ہو گئے موضع لنگر سے میرے دوسرے بھائی سید حمید شاہ (الحاج سید حمید شاہ) بھی ہائی سکول میں داخل ہو کر میرے ہم جماعت ہو گئے۔محترم عبدالعزیز بی۔اے، بی۔ایڈ (قادیانی) اس وقت سکول کے ہیڈ ماسٹر اور بہت سے سینئر اساتذہ میرے والد صاحب کو اچھی طرح جانتے تھے کیونکہ مجھ سے پہلے میرے تین بڑے بھائی اس سکول سے فارغ التحصیل ہو چکے تھے۔

میرے والد مرحوم نے سکول کو اپ گریڈ کرنے کی کوششوں میں ہائی سکول کے بانی سید رحم دریا شاہ کی بھر پور مدد کی تھی اور اپنے گاؤں کے علاوہ علاقے کے دیگر دیہات میں چندہ اُگاہنے میں ان کا ساتھ دیا تھا نیز عربی، فارسی کے جید عالم ہونے کی حیثیت سے سکول میں سب اساتذہ اُن کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے
آتے ہیں جو کام دوسروں کے (اقبال)

چنانچہ ہمارا جماعت ششم میں داخلہ بآسانی ہو گیا کیونکہ اس وقت سکول میں داخلے کے لئے کسی سفارش کی ضرورت نہیں ہوتی تھی بہر حال ششم میں داخلہ ہو جانے کے بعد والد صاحب بری الزمہ ہو گئے اور

اگلا کام ہمارا اورسکول ہی کا تھا جماعت ششم میں ہمارے پہنچنے کے بعد ہمارے پرائمری سکول گکھڑ کے ہیڈ ماسٹر سید لعل شاہ بھی ایس۔ وی پوسٹ پر ترقی پا کر ہائی سکول آ گئے تھے جو ہمیں اُردو پڑھانے لگے اور انگریزی کے لئے ماسٹر ظہور احمد تھے جو تقسیم ہند کے وقت یا بعد میں ہندوستان کے پتہ نہیں کس شہر سے ہجرت کر کے موضع باہتر میں آباد ہو گئے تھے۔اسی طرح حساب (ریاضی) مولوی محمد حسین آف لنگر پڑھانے لگے اور فارسی کی تدریس کیلئے ایک اور مہاجر استاد شیخ محمد علی صاحب مقرر ہوئے اور ایک آدھ استاد اور بھی۔(شیخ محمد علی صاحب مرحوم کا ایک بیٹا مظہر علی بھی ہمارا کلاس فیلو تھا جو اس وقت قد میں چھوٹا ہونے کے باوجود موضع کریما سے سائیکل پر آتا تھا)

ہائی سکول بن جانے پر ڈسٹرکٹ بورڈ ہائی سکول کی حیثیت مرکزی ہو گئی اور اردگرد کے دیہات گکھڑ، لنگر، ڈھوک بلوچ، امیر خان، جھنگ، پیروشاہی، بہلول، دورداد، بٹھو۔حتیٰ کہ انتہائی مغرب میں واقع گاؤں اٹک کے قریب بولیانوال اور انتہائی مشرق میں حسن ابدال کے قریب واقع حصار کریما اور براہمہ کے طلباء بھی اسی سکول میں داخل ہوتے تھے۔سکول میں تدریس کا نظام ابتداء میں تو بہت بہتر تھا مگر بعد میں اساتذہ کی طرف سے سُستی، کاہلی اور بدنظمی آنے لگی ابتدا میں تو ہم اس کی وجہ سمجھ نہ سکے مگر بتدریج ہمیں اندازہ ہو گیا کہ تدریس میں تنزل کی وجہ ہمارے اساتذہ کرام میں پارٹی بازی (گروپ بندی) تھی۔ایک گروپ مقامی اساتذہ کا تھا جس میں سید مزمل شاہ مرحوم، سید رحم دریا شاہ مرحوم، سید فضل حسین شاہ مرحوم، مولوی محمد حسین مرحوم اور چند دیگر افراد شامل تھے اور دوسرے گروپ میں غیر مقامی اساتذہ مثلاً پنڈ سلطانی کے محمد اقبال خان، دوست محمد خان، ملک مہر خان، ملک خاکی جان اور چند دیگر اساتذہ شامل تھے۔ہم پر اس بات کا پورا انکشاف اس دن ہوا جب باہر سے کوئی معائنہ ٹیم اس تنازعے کی تفشیش کے لئے ہمارے سکول آئی تو چونکہ ہم مقامی اساتذہ کے زیادہ قریب تھے تو انہوں نے غیر مقامی اساتذہ کے خلاف ہم سے درخواستیں وغیرہ لکھوائیں تاہم تفشیشی ٹیم کی رپورٹ کے مطابق فیصلہ ہوا کہ گروپ بندی میں ملوث تمام اساتذہ کو یہاں سے تبدیل کر دیا جائے چنانچہ غیر مقامی اساتذہ تو گئے ہی گئے مقامی اساتذہ جو کئی سالوں سے یہاں براجمان تھے ان سب کو کافی دور دراز کے دیہات میں تبدیل کر دیا گیا۔

اگر چہ وہ مختصر عرصے کے بعد اپنا اثر رسوخ استعمال کر کے دوبارہ اس سکول میں واپس آ گئے تاہم اس فضول اور بے جا کشمکش میں تدریسی نظام اور ہمارے حصول تعلیم پر اس کے بہت برے اثرات مرتب ہوئے جس کا ازالہ دیر تک نہ ہو سکا۔ ڈی۔ بی ہائی سکول باہتر حکومت کی پالیسی کے تحت جانے کب پہلے ڈی سی ہائی سکول اور پھر گورنمنٹ ہائی سکول باہتر ہو گیا۔ تاہم طلبہ کے حوالے سے اس میں کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔

آج کل چند گنے چنے لوگ بڑے فخر سے اس بات کا ذکر کرتے ہے کہ وہ بھی ٹاٹ سکول کے پڑھے ہوئے ہیں اگر چہ حقیقت یہ ہے کہ ماضی میں پرائیوٹ سکولوں کا وجود تو تھا نہیں، حصولِ تعلیم زیادہ تر گورنمنٹ سکول ہی ہوا کرتے تھے اور ان میں طلباء کے بیٹھنے کے لئے ٹاٹ ہی ہوا کرتے تھے۔

پرائمری سکول میں تو ہم نے ٹاٹ پر ہی بیٹھ کر ہی پڑھا ابتدائی کلاسوں میں جیوٹ (پٹسن) کی پرانی بوری یا کھجور کے پتوں سے بنی ہوئی کوئی چٹائی گھر سے اپنے ساتھ لے جا کر اس سے کام چلا لیتے جبکہ چوتھی پانچویں کلاس میں سکول کی طرف سے جیوٹ ٹاٹ کا اہتمام ہونے سے ہم ٹاٹ پر بیٹھنے میں فخر محسوس کرتے۔ ہائی سکول کے بارے میں ہم نے سنا تھا کہ وہاں بینچوں اور ڈیسکوں پر بیٹھ کر پڑھا جاتا ہے مگر

اے بسا آرزو کہ خاک شد

ہائی سکول پہنچ کر بھی ابتدائی کلاسوں یعنی چھٹی ساتویں تک ہمیں ٹاٹ تک ہی محدود رکھا گیا مگر آٹھویں جماعت میں ہمیں پہلی مرتبہ بینچ اور ڈیسک مہیا کیئے گئے جس سے یقیناً جونیر کلاسوں کے مقابلے میں ''ہمارے سر فخر سے بلند'' رہنے لگے۔

ہائی سکول باہتر ہمارے گاؤں سے تقریباً چھ، سات کلومیٹر کے فاصلے پر واقع تھا ہمارے گاؤں سے چھٹی سے دسویں تک تقریباً 20 سے 25 طلباء مختلف کلاسوں میں زیر تعلیم تھے جو تقریباً اکٹھے ہی پیدل سکول آتے جاتے۔ اب سکول جانے کے لئے تختی کی ضرورت تو ختم ہو گئی تھی اس کی جگہ اب کپڑے کے ایک گز ٹکڑے میں بندھی ہوئی کتابیں اور کاپیوں نے لے لی جس کے دوسروں کو ہم لمبائی میں باندھ کر کندھے پر لٹکا کر سفر کرتے تھے۔ کپڑے کے ٹکڑے کے علاوہ بعض لڑکوں کو فوجی پٹھو (تھیلہ) بھی دستیاب ہو جاتا جو مضبوط ہونے کے علاوہ کافی باسہولت بھی تھا ہمارے کپڑے اور تھیلوں میں بند یہ بستے جہاں ہماری کتابوں اور کاپیاں

لے جانے کے کام آتے تھے وہاں جب کبھی طلباء آپس میں جھگڑ پڑتے تو یہ بستے ہتھیار کے طور پر بھی کام آتے اور لڑ کے اشتعال میں آ کر آپس میں اس ہتھیار کا آزادانہ استعمال کرتے۔

صبح سکول کے لئے گھر سے نکل کر ہمارا پہلا پڑاؤ قبرستان سے آگے نالہ نندنا عبور کرنے سے ذرا پہلے بائیں ہاتھ ایک چبوترہ تھا جس پر بیٹھ ہم کر ایک دوسرے کا انتظار کرتے۔ یہ چبوترہ کسی نیک انسان نے ستانے ہی کے لئے بنادیا تھا کیونکہ اس پر پھلا ہی کے ایک درخت کا سایہ تقریباً ہر وقت موجود رہتا۔ واپسی پر بھی اس چبوترے (یا تھلے) پر ہم مختصر طور پر دم لے لیتے تھے کیونکہ نالہ نندنا کو عبور کر کے چڑھائی چڑھنے سے ہمارا سانس پھول جاتا اور یہاں رکھے ہوئے پتھروں پر بیٹھ کر چند منٹ کے لئے ہم اپنی سانسیں بحال کر لیتے۔ جاتے ہوئے بقایا سفر ہم بلاتوقف کرتے اور سیدھا سکول پہنچنے کی کوشش کرتے۔ ہائی سکول باہتر گاؤں سے باہر شمال کی طرف بڑے قبرستان کے قریب واقع تھا۔ سکول کا رقبہ اس وقت کے مطابق کافی تھا مگر اس کی چاردیواری نہیں تھی اور چاردیواری کی جگہ مقامی پودے ''سنتھے'' کی باڑ لگی ہوئی تھی۔ سچی بات ہے اس وقت چاردیواری کی جگہ یہ باڑ کہیں زیادہ خوبصورت اور دلکش لگتی تھی۔ سکول کی عمارت اور باڑ کے درمیان کافی وسیع گراؤنڈ تھا جہاں تفریح کے وقت ہم گھوم پھر لیتے۔ اسی گراؤنڈ میں ہاکی اور فٹ بال کے لئے پول بھی لگے ہوتے تھے جہاں سال میں ایک مرتبہ ٹورنامنٹ کے موسم میں اساتذہ کی رہنمائی میں ہاکی اور فٹ بال کی مشق کرتے۔

سکول کے پی۔ ٹی۔ آئی غلام سرور خان کی راہنمائی میں پی ٹی اور مارچ پاسٹ بھی ہم نے اسی گراؤنڈ میں سیکھی۔ پی ٹی مدرس غلام سرور خان ریٹائرڈ فوجی تھے اور اپنی پیشہ ورانہ ذمہ درای خالص فوجی انداز میں سرانجام دیتے تھے۔ ہماری صبح کی اسمبلی بھی اِسی گراؤنڈ میں اُنہی کی نگرانی میں ہوتی تھی۔ اسمبلی میں قومی ترانہ اور قومی پرچم کو خالص فوجی انداز میں سلامی دی جاتی۔ قومی ترانے اور قومی پرچم کے جو آداب پی ٹی ماسٹر غلام سرور خان نے ہمیں ان دنوں سکھائے وہ آج تک ہمارے دل و دماغ پر نقش ہو گئے قومی ترانے کے دوران اٹینشن (Attention) اور (Stand at ease) کے جو طریقے انہوں نے ہمیں سکول کے دوران سکھائے ان کا اثر آج تک ہمارے ذہنوں پر نقش ہے اور آج حب الوطنی کے جو اثرات ہمارے اندر موجود ہیں یہ اس دور کی تربیت کا نتیجہ ہے۔ تاہم مشاہدے میں آیا ہے کہ آج کل قومی ترانے اور قومی پرچم کے صحیح

آداب کی معلومات کم ہو رہی ہیں۔سکولوں اور دیگر تقریبات میں قومی ترانے کے آداب سے مناسب واقفیت کا فقدان نظر آتا ہے۔

اسمبلی میں طلباء قد کے لحاظ سے کھڑے ہوتے تھے یعنی چھوٹے قد کے طلباء قطار میں سب سے آگے اور پھر پیچھے بتدریج قد کے لحاظ سے۔راقم اسمبلی میں اپنی کلاس کی قطار میں سب سے آگے کھڑا ہوتا تھا تو اس کا مطلب یہ کہ بچپن میں مَیں اپنے ہم جماعتوں کی نسبت قد میں چھوٹا تھا،اس کی وجہ انسانی جسم اور قد میں قدرتی فرق بھی ہوسکتا ہے اور یہ وجہ بھی ہوسکتی ہے کہ ابتدائی کلاسوں میں عمر کے لحاظ سے میں نے جلد ترقی پالی تھی۔بعض طلباء تو داخلے کے وقت ہی طبعی عمر کے لحاظ سے کافی بڑے ہوتے ہیں۔تو بڑی کلاسوں میں جا کر بھی وہ عمر کی وجہ سے قد میں بڑے ہوتے ہیں بس یہی وجہ تھی ہمارے کلاس میں چھوٹا ہونے کی۔

ہائی سکول میں جماعت ششم سے جماعت دہم تک ہماری تعلیم درجہ بدرجہ جاری رہی۔دیہی سکول ہونے کی وجہ سے تعلیم کا معیار کوئی خاص نہیں تھا مگر تعلیم کی بنیادیں درست ہونے کی وجہ سے اور ساتھ ساتھ برادران بزرگ کی گھر پر تعلیمی راہنمائی کی وجہ سے ہم آسانی سے آگے بڑھتے گئے۔

چھٹی اور ساتویں کلاس جوں توں کر کے ہم نے پاس کرلیں آٹھویں کا امتحان اس وقت بورڈ کا امتحان ہوا کرتا تھا چنانچہ آٹھویں جماعت میں آتے ہی ہمیں بتادیا گیا کہ آپ کا امتحان بورڈ کا ہوگا۔جس کے لئے تیاری کی ضرورت ہوگی چنانچہ ہم اپنے طور پر ہی اس کی تیاری کرنے لگے۔چنانچہ سال کے آخر میں سکول میں ہی امتحان کا انعقاد ہوا مگر امتحانی عملہ باہر سے آیا ہوا تھا۔دراصل اس وقت ثانوی تعلیمی بورڈ تو نہیں تھا مگر آٹھویں جماعت کا امتحان محکمہ تعلیم پنجاب کے رجسٹرار محکمانہ امتحانات کا ایک دفتر لیتا تھا۔امتحان ہوگیا اور کافی عرصہ بعد نتیجہ آگیا جس میں ہمیں درجہ دوم (سیکنڈ ڈویژن) میں کامیابی نصیب ہوئی جس کا سرٹیفکیٹ آج بھی ہمارے پاس موجود ہے۔

چھٹی سے آٹھویں تک اساتذہ کا ذکر:

سید رحم دریا شاہ مرحوم:

ان کا ذکر بطور بانیِ سکول آ چکا ہے۔ ان کا رعب اور دبدبہ مشہور تھا۔ ساتویں کلاس میں جب انہوں نے ہماری اردو کی کلاس شروع کی تو ہمیں بہت ڈرایا گیا۔ واقعی جب پہلے دن کا کام چیک ہوا تو ایک حرف کی غلطی پر بھی ایک ایک بید (چھڑی) کی سزا دی گئی ان کا ڈنڈا، بیت یا چھڑی تو دیکھ کر ہی ہماری جان جاتی تھی اور پھر کاپیوں کی پہلی چیکنگ پر تو اس کا تلخ سا تجربہ بھی ہو گیا۔ اس دن میرے سمیت تقریباً تمام طلباء کے ہاتھ سوجے ہوئے تھے مگر ساتھ ہی آئندہ کے لئے ہماری تمام توجہ اردو کی کاپیوں پر ہوتی تھی کیونکہ اس میں ذرہ برابر غلطی کی گنجائش نہیں ہوتی تھی۔ تاہم یہ بات قابل ذکر ہے کہ سید رحم دریا صاحب نے سارا زور پہلے دن ہی نکال لیا اور سال کے آئندہ دنوں کے لئے انہیں اپنی مصروفیات سے وقت ہی نہ مل سکا نتیجے کے طور پر خوف کے نتیجے میں ہماری اُردو کی لکھائی میں کافی بہتری آ گئی اور باقی سال ہمارے ہاتھ بید (بانس کا ڈنڈا) کی براہ راست برکات سے محفوظ رہے۔

سید مزمل شاہ مرحوم:۔

یہ سید صاحب ہمیں آٹھویں میں معاشرتی علوم پڑھاتے تھے۔ پہلے تو ہم سمجھتے تھے کہ وہ سکول کے وائس پرنسپل ہیں اور سکول میں ڈاکخانے کا کام ہی کرتے ہیں۔

اپنے بڑے برادران اور سینئر طلباء سے ان کے رعب داب کے بارے میں کافی کچھ سن رکھا تھا مگر ہم نے دو سال تک انہیں سکول کی U ٹائپ بلڈنگ میں ایک کونے پر بنے ہوئے چھوٹے کمرے میں ہی دیکھا جس کی کھڑکی باہر گراؤنڈ کی طرف کھلتی تھی مگر آٹھویں جماعت میں پہنچ کر جب انہیں معاشرتی علوم کا پیریڈ ملا تو ہمیں پتہ چلا کہ وہ سکول کے استاد بھی ہیں۔ ان کا طریقہ تدریس یہ تھا کہ ہفتے میں ایک مرتبہ کلاس میں آتے اور آ کر کرسی پر بیٹھ جاتے۔ سامنے دیوار پر دنیا کا نقشہ لگا ہوتا جس پر بیٹھے بیٹھے ہی وہ سبق کے ساتھ ساتھ نشاندہی کرتے جاتے اِس دوران تمام طلبہ ہمہ تن گوش ہو کے ان کو سنتے، متوجہ رہنے کی دو وجوہات تھیں ایک تو ان کا متاثر کن لہجہ دوسرا ان کا خوف جو ان کے چہرے کی بھاری مونچھوں اور ہلکی ملگجی داڑھی سے ہر وقت عیاں رہتا۔

تاریخ کی تدریس پر آ جاتے تو پوری اسلامی تاریخ اور تاریخ ہند و پاک کو کھنگال کر رکھ دیتے۔ اخلاقیات کے درس پر شروع ہو جاتے تو ایسے ایسے نکتے بیاں کرتے کہ ہمیں ایک عظیم فلسفی اور دانشور سے کم نہ لگتے اور سچی بات ہے کہ ان کے چند دروس سے حاصل کیے گئے اصول آج تک ہماری زندگی میں جاری وساری ہیں۔

لطیفے کی بات:

شاہ صاحب عموماً اپنے پیریڈ (دوسرے یا تیسرے پیریڈ میں گھنٹی بجتے ہی آ جاتے۔ ان کے ہاتھ میں بھی بانس کا ایک بیت ہوتا تھا جو دیکھنے میں بہت چھوٹا ہوتا مگر جہاں پڑتا ایسے لگتا جیسے اندر تک چلا گیا ہو۔ لچک اتنی تھی کہ ٹوٹنے کا نام ہی نہیں لیتا اور یہ بیت ایک مدت سے ان کے تصرف میں تھا حتٰی کہ ہمارے کچھ جانباز قسم کے کلاس فیلوز نے کسی طرح اسے اڑالیا اور اسے توڑ تاڑ کر ساتھ والے قبرستان میں ایسا دفن کر دیا کہ اس کے بعد اس کا نشان تک نہ ملا۔ بتا رہا تھا کہ شاہ صاحب دوسرے یا تیسرے پیریڈ میں اپنے مضمون کی تدریس کے لئے آ جاتے ان کا درس جاری رہتا کہ پریڈ ختم ہونے کی گھنٹی بج جاتی تو اگلے پیریڈ کے استاد آ کر دروازے پر کھڑے ہو جاتے۔ طلباء نئے استاد کو دیکھ لیتے مگر شاہ صاحب اپنے سبق کے لیکچر میں اتنے مصروف ہوتے کہ انہیں کافی دیر بعد نئے استاد کے آنے کی خبر ہوتی دروازے کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے استاد سے پوچھتے کہ آپ کا پیریڈ ہے اور کس مضمون کا؟ جب استاد مثلاً کہتا کہ اسلامیات کا تو فرماتے کہ میں بھی تو اسلامیات پڑھا رہا ہوں اور طلباء سے اس کی بآواز بلند تصدیق بھی کروا لیتے اگلے پیریڈ میں جب انگلش کا استاد آتا تو اس کو بھی اپنی اسی مسکراہٹ کے ساتھ وہی جواب دیتے کہ میں بھی انگلش پڑھا رہا ہوں حتیٰ کہ تفریح کی گھنٹی بجتی تو ہماری جان چھٹتی لیکن میں ایک مرتبہ پھر کہتا ہوں کہ ان کے درس کی گونج اور ان کے اخلاقیات کے درس کے نقوش آج تک ہمارے ذہنوں پر ثبت ہیں۔

سید فضل حسین شاہ:

تعلیمی لحاظ سے ادیب فاضل، منشی فاضل اور پتہ نہیں کیا کیا فاضل تھے آٹھویں سے پہلے اردو پڑھاتے چلے آ رہے تھے ان کے پاس اردو زبان وادب کا بے پناہ ذخیرہ تھا اور وہ کلاس میں اس کے بآواز بلند استعمال بھی کرتے تھے۔ اُردو تلفظ، حروف کی بناوٹ اور الفاظ کی پوری تاریخ انہیں ازبر ہوتی، بعض اوقات وہ



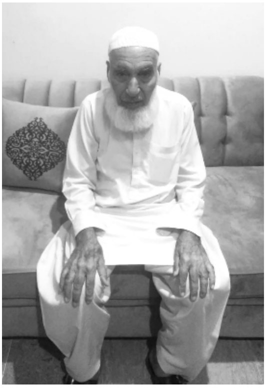
تشریح کرتے وقت اتنے دور نکل جاتے کہ وہ مواد ہمارے سر سے اوپر سے گزر جاتا۔ تاہم بعض شعر اور مصرعے وہ اتنی کثرت سے دہراتے رہتے کہ وہ آج تک ہمارے حافظے میں محفوظ ہیں۔ اُردو ادب کا جو تھوڑا بہت ذوق ہمارے اندر موجود رہا اس میں شاہ فضل حسین مرحوم کی تدریس کا بہت اہم حصہ ہے۔

یہ شاہ صاحب بھی کبھی کبھی مانگے تانگے کا بید (ڈنڈا) استعمال کرتے مگر سزا دیتے وقت ان کے چہرے پر رہنے والی مسکراہٹ بھی موجود رہتی۔ تو اکثر ایسا ہوتا کہ کوئی بڑا لڑکا یا ان کے گاؤں کا یا واقف کار لڑکا سزا دیتے وقت ان کا ڈنڈا ہاتھ میں پکڑ لیتا اور پھر ڈنڈا چھڑانے اور دوبارہ پکڑے جانے کی کشمکش میں پریڈ ختم ہو جاتا اور شاہ صاحب اسی طرح مسکراتے ہوئے کمرہ جماعت سے باہر چلے جاتے۔

آٹھویں کا امتحان پاس کر کے نویں میں ہمارے ہم جماعت بہت کم رہ گئے اس کی وجہ کچھ طلبہ کی بورڈ کے امتحان میں ناکامی اور چند طلبہ ویسے ہی سکول چھوڑ گئے مثلاً میرے پانچویں کے ہم جماعتوں میں آٹھویں تک پہنچنے والے عبدالمجید امتحان تو پاس کر گئے مگر یتیم اور غریب ہونے کی وجہ سے آگے جماعت نہم میں جاری نہ رکھ سکے۔ عبدالجلیل میرے دوسرے ہم جماعت آٹھویں میں فیل ہو گئے تو اس طرح ہم کوئی بیس کے قریب ہم جماعت جماعت نہم میں پہنچ سکے۔ یعنی پوری دس بارہ گاؤں میں اس عمر کے ہزاروں بچوں میں صرف بیس طلبہ ہی جماعت نہم تک پہنچ سکے۔ علاقے میں اس وقت کی تعلیمی حالت کا اندازہ ہم آج کی تعلیمی اصطلاح ''ڈراپ آؤٹ ریٹ'' سے لگا سکتے ہیں۔ کاش ماضی میں بھی تعلیم اور شرح خواندگی پر زور دیا جاتا تو آج ہماری قوم کہاں کھڑی ہوتی میں جماعت ہشتم کے بورڈ امتحان کی بات کر رہا تھا۔ بورڈ کا امتحان قریب آیا تو آٹھویں کے تمام طلباء کے لئے بورڈنگ ہاؤس (ہاسٹل) میں رہنا لازمی قرار دیا گیا۔

بورڈنگ سکول سے چند فرلانگ کے فاصلے پر قصبے کے اندر بس اڈے سے ملحقہ عمارت میں واقعہ تھا جس میں چند کمرے رہائش کے لئے وقف ہو گئے۔ ہم بستر گھر سے لے گئے اور اور تمام طلباء کے بستر فرش صاف کر کے نیچے لگا دیئے گئے۔ چار پائیاں دستیاب بھی نہیں تھیں اور ان کے لئے کمرے میں جگہ بھی نہیں تھی

ہمیں ہدایت ملی کہ آٹا اور گھی ہرلڑکا گھر سے ساتھ لائے گا اور باقی کھانے کے مناسب اخراجات مہینے کے آخر میں ادا کرنے ہوں گے۔ایک کک بہادر کی خدمات حاصل کی گئیں جو روٹیاں تو جلی ہوئے کھلاتا تھا مگر ہنس مکھ اور خوش مزاج انسان تھا کام سے فارغ ہوکر وہ اکثر اونچی آواز میں گانے گاتا رہتا تھا اور اپنی خوش آوازی کی داد ہم سے وصول کرنا نہ بھولتا۔اس طرح ہمارے مسافری کے چند دن بہت اچھے گزر گئے۔ یاد رہے کہ اس دوران شام کو یارات کو جو اساتذہ پڑھانے آتے وہ بلا معاوضہ یہ خدمات انجام دیتے اور کسی قسم کی ٹیوشن فیس یا کوچنگ فیس کا تصور بھی اس وقت نہیں تھا۔



سردار دوست محمد خان (ہیڈ ماسٹر)

بورڈنگ میں رہائش کے دوران کوئی باقاعدہ کلاس یا تدریس تو نہ ہوتی مگر اجتماعی مطالعہ امتحان کی تیاری کیلئے مسابقت کا ایک ماحول ضرور ملا جس میں ہم آنے والے امتحان کی تیاری بہتر طریقے سے کر سکے۔آٹھویں کا امتحان پاس کر کے جب ہم نویں کلاس میں پہنچے تو ہمیں خاص کلاس کا درجہ مل گیا۔ سکول کے سینئر استاد ہمیں پڑھانے لگے جن میں دوست محمد خان ہیڈ ماسٹر (جو جونیئر کلاسوں میں اساتذہ کے تنازعہ کے وقت بھی بطور ان ٹرینڈ ٹیچر موجود تھے مگر اب وہ بی ایڈ کر کے بطور ہیڈ ماسٹر تعینات ہو گئے تھے وہ ہماری انگریزی کی کلاس لینے لگے۔ وہ گارڈن کالج روالپنڈی کے گریجویٹ تھے اور انگلش میں نہ صرف خود مہارت رکھتے تھے بلکہ بی ایڈ کر کے تدریس کے تمام پہلوؤں سے بھی واقف تھے اور ان کو ہماری کلاس میں لاگو کرنے لگے۔ ہیڈ ماسٹر دوست محمد خان بعد میں ریٹائرڈ ہوکر اپنے گاؤں پنڈ سلطانی میں رہائش پزیر ہو گئے اور میں پشاور میں رہائش پزیر ہوگیا۔مدت تک ان کے ساتھ کوئی رابطہ نہ تھا مگر اسی کی دہائی میں میرے پرائیویٹ سکول میں ایک لڑکی (خاتون ٹیچر) نے بتایا کہ وہ پنڈ سلطانی کی ہیں اور دوست محمد خان کی رشتہ دار ہیں میں نے ازراہ محبت اور احترام ان کے لئے اسی خاتون ٹیچر کے ہاتھ ایک پارکر پین اور خط بھیج کر اپنی شاگردانہ عقیدت کی یاد دہانی کروائی۔ جواب میں انہوں نے بھی ایک محبت نامہ بھیجا جو میرے پاس آج بھی کہیں محفوظ ہے۔ دوست محمد خان میرے بعد میرے چھوٹے بھائیوں اور دیگر عزیزوں کے بھی استاد اور ہیڈ ماسٹر رہے ہیں آج کل وہ

تقریباً پچاسی سال کی عمر کو پہنچ چکے ہیں اور بفضل تعالیٰ حیات ہیں اور میں ہر سال 5 اکتوبر کو (عالمی یومِ اساتذہ) پر ان کو موبائل پر فون کر کے سلام پیش کرتا ہوں۔

یہ ایک اتفاق تھا یا محکمہ تعلیم کی محکمانہ پالیسی کا حصہ کہ اس سال (1962ء میں) نویں جماعت کا امتحان بھی بورڈ (لاہور ثانوی تعلیمی بورڈ) کے تحت لینا قرار پایا چنانچہ ہم نے فتح جنگ میں قائم سنٹر میں نویں جماعت کا بورڈ کا امتحان دیا اور کامیاب ہوئے مگر صرف ایک سال بورڈ کا امتحان لے کر اگلے سال کے لئے اس کو ختم کر دیا گیا اگلے سال دسویں کا امتحان بھی ہم نے معمول کے مطابق ثانوی تعلیمی بورڈ کے تحت (فتح جنگ سنٹر) میں دیا جو دو حصوں میں ہم نے پاس کر لیا۔ یاد رہے کہ آج کل تمام بورڈز نویں اور دسویں جماعت کا امتحان الگ الگ لے رہے ہیں مگر ہمارے دور میں صرف ایک سال کے علاوہ تمام امتحانات مشترکہ (کمپوزٹ) سسٹم کے تحت لئے جاتے تھے۔

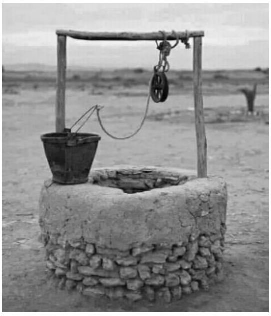
''اب تھوڑا سا سکول سے باہر۔ سکول تک آمدورفت کا قصہ''

جیسا کہ پہلے بتا چکا ہوں سکول ہمارے گھر سے 7,6 کلو میٹر کے فاصلے پر واقع تھا جس تک ہم روزانہ پیدل چل کر جایا اور آیا کرتے تھے پتہ نہیں کہ سردیوں میں زیادہ مشکلات ہوتی تھیں یا گرمیوں میں مگر سچ تو یہ ہے کہ دونوں موسم کبھی ہماری راہ میں حائل نہیں ہوئے نہ ہمیں مقصد سے ہٹا سکے۔

جاڑے کی سردیوں میں صبح سویرے نکلنا اور وقت پر سکول پہنچنا، گھڑیاں تو اس وقت موجود نہیں تھیں مگر سکول سے ایک دو فرلانگ دور اگر اسمبلی کی پہلی گھنٹی جو مسلسل ہو جاتی تو وہ فاصلہ ہم دوڑ کر پورا کرتے اور دوسری گھنٹی تک سکول پہنچ جاتے اور اکثر پی۔ ٹی۔ آئی صاحب کی بیت کی سزا سے بچ جاتے (یہ بات قابل ذکر ہے کہ ہمارے پی ٹی آئی صاحب ریٹائرڈ فوجی ہونے کے باوجود بہت مہربان اور خلیق انسان تھے)۔

سکول میں تفریح کے وقت اپنے اپنے بستے سے اپنے لنچ باکس (روٹیاں) نکال لیتے۔ یہ لنچ باکس عموماً پراٹھے پر مشتمل ہوتا جو ہماری والدہ تیار کر کے ایک رومال میں باندھ کر ہمارے بستے کے ایک کونے میں رکھ دیتیں۔ تفریح کی گھنٹی بجتے ہی ہم سب ساتھی قبرستان کا رخ کرتے اور کسی گھنے درخت کی چھاؤں ڈھونڈ کر اس کے نیچے بیٹھ جاتے اور اپنے اپنے رومال کھول کر ماحضر تناول فرما لیتے۔ آپ حیران ہونگے کہ صرف پراٹھے

پر مبنی لنچ ؟ تو یقین کریں کہ خالص گندم اور خالص دیسی گھی سے بنے ہوئے پراٹھے کے ساتھ کسی تیسری خوراک کی ضرورت کم ہی محسوس ہوتی تھی اور ویسے کفایت شعاری کا تقاضا بھی تھا اس سب کے باوجود ہم کبھی کبھی اسراف بھی کر لیتے تھے اور وہ پراٹھے کے ساتھ دو پیسے (ایک ٹکے) کے چھولے لے لیتے اور یہ ہماری عیاشی کا دن ہوتا (دو پیسے یا ٹکہ نصف آنہ ہوتا اور سولہ آنے کا ایک روپیہ ہوتا تھا) پورے ایک آنے کے چھولے کھانے والے لڑکوں کو یا تو بہت امیر کبیر سمجھتے تھے یا وہ کوئی ناجائز ذرائع استعمال کر کے (یعنی آف شور کمپنیوں کی آمدن سے) یہ عیاشی کرتے۔ ابتدا میں چھولے بیچنے والا ایک ضعیف بابا ہوتا تھا جس کے فوت ہو جانے یا زیادہ ضعیف ہو جانے پر قدرے ایک نوجوان ''کھنڈا'' (ایک ہاتھ سے معذور) شخص نے یہ کاروبار سنبھال لیا۔ اور ہمارے سکول چھوڑنے تک سکول میں چھولوں کے کاروبار پر اسی شخص کی اجارہ داری رہی۔ تفریح کے پیریڈ کے دوران ہم لنچ اور حاجات ضروریہ سے فارغ ہونے کے علاوہ سکول گراؤنڈ میں بھاگ دوڑ کر مزید تفریح بھی کر لیتے۔



ڈول والا کنواں

سکول سے چھٹی کے بعد ہم کبھی کبھی باہتر بازار کا بھی چکر لگا لیتے باہتر گاؤں دو حصوں بالا اور پایان (اُتلا اور تھلا باہتر) پر مشتمل تھا اپنے گاؤں جاتے ہوئے موڈ ہوتا تو تھلے باہتر کے بازار کا چکر بھی لگا لیتے اور ضرورت اور مزے کی کوئی چیز (پکوڑے یا مٹھائیاں) خرید لیتے ورنہ اکثر باہر سے ہی گاؤں کے لئے روانہ ہو جاتے۔ واپسی پر ہمارا پہلا پڑاؤ پیر صاحب والے بابے کے مزار کے قریب واقع ٹھنڈے پانی کے کنویں کے قریب پھلاہی کے درخت کا سایہ ہوتا۔ یہاں ہم کنویں کے ٹھنڈے پانی سے پیاس بجھاتے۔ کنویں پر رسی سے بندھا ہوا چمڑے کے ایک ڈول کو پیالے یا گلاس کے طور پر استعمال کرتے ہوئے ہم سب اپنی پیاس بجھا لیتے اور بسا اوقات دوسرا ڈول نکالنے کی ضرورت نہ پڑتی۔ پانی پینے کے علاوہ ہمارے گاؤں کے کچھ سینئر لڑکے چلم پی کر اپنا نشہ بھی پورا کرتے ہم شروع میں چھوٹا ہونے کے حیثیت سے چلم نوشی کی نعمت سے محروم رہے لیکن جب سینئر کلاسوں میں پہنچے تو اس وقت یا تو ہمارے سینئر لڑکے آٹھویں پاس کر کے سکول چھوڑ چکے تھے قیادت ختم ہو چکی تھی اور کچھ سینیارٹی نے ہمیں تمباکو نوشی سے پرہیز کی ہدایت عطاء فرما دی تھی۔

مگر یہ بات طے ہے کہ سکول کے دوران اپنے بعض ہم عمر طلباء کی چلم نوشی کی عادت کے باوجود ہم خود اس لعنت سے بچے رہے۔ پانی پینے اور چلم نوشی کے ٹھکانے سے اُٹھ کر ہم بابے کی زیارت کا سلام کرتے ہوئے واپس گاؤں کی طرف چلتے اور تقریباً ایک ڈیڑھ کلومیٹر تک پہاڑوں کے بیچ پتھریلے راستے کو طے کرتے ہوئے سخت گرمی کے موسم میں نالہ نندنا پہنچنے سے پہلے راستے کے دائیں طرف سرِ راہ ایستادہ شیشم کے دو بڑے درختوں کی گھنی چھاؤں تلے بھی سستانے کے لئے بیٹھ جاتے۔

بیٹھ جاتا ہوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے

اور یہاں سے اُٹھ کر اگر گرمی نے زیادہ ستایا تو نالہ نندنا کے صاف شفاف پانی میں کسی ڈھنڈ (گہرے پانی) میں ڈبکیاں لگا کر اور تیر کر swimming کے مزے بھی مفت میں لے لیتے تھے swimming یا تیراکی میں نے نالہ نندنا کے طفیل سیکھی۔ ہمارے تعلیمی ادوار میں لڑکپن تک نالہ نندنا کی ہماری روزمرہ زندگی میں بڑی اہمیت رہی ہے ہائی سکول جاتے آتے ہوئے ہمیں دن میں دو مرتبہ اس نالے کو پار کرنا ہوتا تھا۔ خشک موسم میں پانی پر رکھے ہوئے پتھروں پر قدم بقدم چل کر یا پانی کے قدرے زیادہ بہاؤ میں جوتے اتار کر سردی گرمی میں نالے کو عبور کرنا۔ اور مزید تیز پانی میں نالہ عبور کرتے وقت ہم بسا اوقات اپنی کچھ ضروری اشیاء مثلاً جوتے، چادر، یا بستے سے محروم بھی ہو جاتے تھے جو دریا کے تیز بہاؤ کی نظر ہو جاتے مگر ہم اور ہمارے گھر والے اس پر قناعت کر کے خوش رہتے کہ چلیں اپنی جان تو بچی۔۔۔ ہاں نالہ نندنا جس کا پانی پی کر ہم بڑے ہوئے وہ ہمیں تمام تر سہولتیں اور خوشیاں مہیا کرنے کے باوجود کبھی کبھی ہمیں یعنی اردگرد کی آبادیوں کو اپنے غضب کا نشانہ بھی بناتا۔ اس کا سیلابی پانی بسا اوقات انسانوں کو اپنے ساتھ بہا لے جاتا اور بہت محنت سے آباد کی گئی پن چکی، رہٹوں اور حتیٰ کہ آباد شدہ قابل کاشت زمینوں کو بھی بہا کر لے جاتا۔ مگر اسی سدا بہار اور دائمی نالے پر ہماری زندگی کا دارومدار تھا اور اس کی مہربانیوں کی عنایات کے ساتھ ساتھ اس کے غضب کو برداشت کرنا بھی ہماری زندگی کا معمول تھا۔ (نالہ نندنا کا تفصیلی ذکر ابتدائی باب میں نسبتاً تفصیل سے موجود ہے)۔ ہائی سکول کے اِن ادوار میں ہمارے کچھ اور معمولات بھی تھے جن کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

ساٹھ کی دہائی میں صدر ایوب خان کی حکومت آئی تو انہوں نے بنیادی جمہوریتوں کا نظام رائج کیا اس

سے پہلے سویلین دور میں پارلیمانی انتخابات بھی ہوئے ہونگے مگر اس وقت تک سیاست اشرافیہ کا کھیل ہی رہا تھا اور عوام سے اس کا براہ راست تعلق صرف گاؤں کے چند معززین تک ہی ہوتا تھا مگر بنیادی جمہوریتوں کے نظام نے سیاسی شعور کو محلے محلے اور گاؤں تک پہنچا دیا۔ اس نظام کے مثبت اور منفی دونوں پہلو برامد ہوئے منفی پہلو میں گاؤں اور محلوں میں دشمنیوں اور رقابتوں کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہوا جس کے اثرات دہائیوں تک موجود رہے۔

ہمارا گاؤں بھی اس سے متاثر ہوا۔ گاؤں کے لوگوں کے اصرار پر ہمارے والد مرحوم بھی ان انتخابات میں کھڑے ہوئے اور سب سے زیادہ ووٹ لے کر کامیاب بھی رہے۔ مگر نتائج کے بعد انتخابات کے منفی پہلو بھی اجاگر ہونا شروع ہو گئے۔ یعنی محلوں اور برادریوں کی رقابتیں جاگ اُٹھیں۔

ان رقابتوں کا اثر ہم طلباء پر بھی پڑا اور سکول جانے والے طلباء واضح طور پر دو دھڑوں میں تقسیم ہو گئے۔ برادریوں اور گروہوں کے نام لینا تو پرانے زخموں کو کریدنے کے مترادف ہوگا مگر سکول جانے والے طلباء کے گروپوں میں تکرار، تو تکار اور مکمل جنگ یعنی لاٹھیوں اور پتھروں سے لڑائی روزمرہ کا معمول بن گیا۔ ایک مرتبہ سکول سے واپسی پر غالباً آٹھویں یا نویں جماعت میں ہمارے طلباء کے انہی دو گروہوں میں جم کر لڑائی ہوئی اور اس میں میرے سمیت کئی لڑکے زخمی ہوئے اور پھر بات بڑوں تک پُہنچی۔ میں بھی زخمیوں میں شامل تھا چنانچہ ہمارے بڑے اور خصوصاً نوجوانوں نے اس کا بدلہ لینے اور ہر قسم کی قربانی دینے کا عندیہ دیدیا مگر ہمارے والد صاحب مرحوم کی صلح جوئی اور جرگے کے بزرگوں کی وجہ سے پورے گاؤں کے دو حصوں میں تقسیم ہو کر ایک مکمل لڑائی ہوتے ہوتے رہ گئی۔ یہ ایک سنگین نوعیت کا واقع تھا جو ہمارے زمانہ طالب علمی سے تعلق رکھتا ہے اس کے اسباب کیا ہو سکتے ہیں۔ وقتی نوعیت، سیاسی وجوہات یا ہمارے تعلیمی نظام میں تربیت کی کمی۔ بہر حال قابل افسوس ضرور ہے۔

نوعمری کی جذباتیت: (موضع لنگر و گکھڑ آمنے سامنے):

ایک اہم فیچر جوان پانچ سالوں میں ہم نے شروع کے سالوں میں دیکھا کہ گاؤں گکھڑ اور گاؤں لنگر جو موضع باہتر سے برابر فاصلے پر بالترتیب جنوب اور مغرب میں واقع ہیں کے ہائی سکول میں پڑھنے والے طلباء کی آپس کی چپقلش تھی جو ہر سال موسم گرما کی تعطیلات شروع ہونے یعنی جس دن تعطیلات کا اعلان ہوتا تو یہ

دونوں طلباء آپس میں لڑائی کے لئے صف آرا ہو جاتے۔ ہم نے شروع سے سن رکھا تھا کہ کس طرح فلاں گاؤں کے فلاں لڑکے نے فلاں گاؤں کے فلاں لڑکے کو پیٹا۔ کس نے بالوں سے پکڑا اور کس نے مکے اور تھپڑ رسید کیے۔ اس کشمکش اور جھگڑے کو آپ ضد اور خدا واسطے کا بیر کہہ سکتے ہیں ورنہ مجھے تو اس ضد اور کشمکش کی کوئی وجہ آج تک سمجھ نہیں آئی۔ اس معاملے کا دلچسپ پہلو یہ بھی تھا کہ یہ جھگڑا اور ایک دوسرے پر توپیں تاننے کا عمل صرف چھٹیوں سے پہلے والے دن ہی ہوتا، باقی دنوں میں سکول کے اندر یا باہر اس قسم کی کوئی کشمکش نہیں دیکھی گئی۔ ہمارا تعلق موضع گکھڑ سے تھا اور لنگر ہمارا جدی گاؤں تھا وہاں ہمارے بھائی، رشتہ دار، او ہمارے کزن وغیرہ رہتے تھے اور ہمارا تعلق گکھڑ سے تھا لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کشمکش میں ہم اور ہمارے بھائی اور رشتہ دار اپنے اپنے گاؤں کے پُر جوش حمایتی ہوتے تھے۔

گورنمنٹ ہائی سکول باہتر میں آخری دن:

دسویں جماعت میں آخری دنوں میں ہمارے مطالعہ اور پڑھائی یعنی تعلیم و تدریس دونوں کی یکسوئی میں اضافہ ہو گیا تھا ہمارے انگلش ٹیچر ہمارے ہیڈ ماسٹر دوست محمد خان ہمیں چھٹی کے بعد بھی بٹھا کر پڑھانے لگے تھے مگر جلد ہی مارچ 1963ء کا وہ دن آ گیا جس دن ہمیں الوداعی دعوت دے کر سکول سے رُخصت ہونا تھا۔ اس کو ہم آج کی طرح اس وقت بھی الوداعی دعوت ہی کہتے تھے۔ سکول کے لان میں سادہ سی تقریب ہوئی جس میں جماعت نہم اور دہم کی طرف سے ایک ایک طالب علم سے ہمیں لکھی ہوئی تقریریں سننے کو ملیں اور وہ مشہور شعر۔۔۔ میں بھی مسافر تو بھی مسافر۔۔۔ الوداع سننے کو ملا۔ مگر یقین جانئے کہ یہ پہلا اور آخری دن تھا جب اس شعر نے ہمارے جذبات میں ہلچل پیدا کی۔ ہمیں یقین ہو گیا کہ جس سکول میں ہم نے پانچ سال گزارے۔ جہاں ہم نے بہت سے دوست بنائے۔ جہاں ہمارے مخلص اور مہربان اساتذہ نے ہماری زندگی بنانے میں راہنمائی کی آج اُن سے واقعی ہم رُخصت ہو رہے ہیں تقریب میں ہیڈ ماسٹر صاحب کی تقریر کے بعد ہمارے لئے چائے پیش کی گئی جس میں ہم نے پہلی مرتبہ پیسٹریاں دیکھیں اور چائے کے ساتھ کھائیں۔

چائے پی کر ہم دوستوں سے گلے ملے اور اساتذہ سے ہاتھ ملائے (اس دور میں اساتذہ سے گلے ملنا سوئے ادب کے خلاف تھا) اور پھر ہم اپنے گاؤں کی طرف روانہ ہو گئے پہلے بتا چکا ہوں کہ دسویں تک پہنچتے پہنچتے میں اپنے گاؤں کا واحد لڑکا اپنی کلاس میں رہ گیا تھا سو میں بوجھل قدموں سے اکیلا ہی گاؤں کی طرف

رواں دواں تھا۔ باہتر سے نکل کر کھیتوں کی پگڈنڈیوں سے ہوتے ہی زیارت کو کراس کر کے پہاڑیوں کے درمیان پتھریلے راستے کو اکیلے عبور کر کے آخر میں جب میں نالہ نندنا عبور کر رہا تھا تو اب میرے سامنے پانچ سال کے تیرہ ہزار تین سو بیس (13320) کلومیٹر طے کرنے کے بعد کل پیدل سفر کا آخری کلومیٹر باقی تھا۔ اور مجھے اپنا گاؤں اور اپنے گھر کے قریب واقع مسجد کا مینار نظر آ رہا تھا اور میں چند ہی ساعتوں میں یہ آخری کلومیٹر کا سفر طے کر کے اپنے گھر پہنچ چکا تھا۔

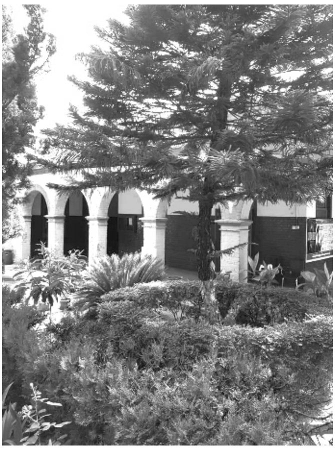
سکول کے تعلیمی ماحول سے فراغت اور پانچ سال تک مادر علمی رہنے والے ادارے سے رخصتی پر میں بیک وقت خوشی اور غم کے جذبات کا شکار تھا ان جذبات کا اظہار تو مشکل ہے مگر گھر پہنچ کر میں نے بستہ گلے سے اتار کر رکھا تو میری والدہ نے اپنی معمول کی مسکراہٹ سے میرا استقبال کیا میرا ماتھا چوم کر مجھے خوش آمدید کہا کیونکہ آج میری اندرونی کشمکش کو میری والدہ سے بہتر کوئی نہیں جانتا تھا۔

گورنمنٹ کالج کیمبلپور (اٹک)



کیمبلپور (اٹک) شمالی پنجاب کا آخری ضلع ہے جس کے مشرق کی طرف راولپنڈی، شمال کی طرف ہزارہ کا ضلع ہری پور اور مغرب میں دریائے سندھ کی حد بناتا ہوا صوبہ خیبر پختون خوا کے ضلع نوشہرہ سے اٹک اور خیر آباد پر ملتا ہے۔ 1849ء میں انگریزوں نے اٹک کو فتح کیا۔ 1903 میں اٹک خورد کے پرانے شہر کے

مشرق کی جانب اس شہر کی بنیاد رکھی گئی برطانوی فوج کے کمانڈر انچیف سر کالن کیمبل کے نام پر اس کا نام کیمبل پور رکھا گیا اور 1904 میں ملحقہ تحصیلیں ملا کر یہاں کیمبلپور ضلع قائم کیا گیا اس ضلع کا ابتدائی نام بھی اٹک ہی تھا جسے تبدیل کر کے کیمبلپور رکھا گیا اور بعد ازاں 1978ء میں دوبارہ اس کا نام کیمبلپور سے تبدیل کر کے اٹک رکھ دیا گیا۔



گورنمنٹ کالج کیملپور (اٹک) علاقے کا بلکہ پنجاب کے شمالی اضلاع کا قدیم ترین کالج ہے جو 1924ء میں پہلے انٹر کالج کے طور پر قائم ہوا اور پھر 1942ء میں اسے ڈگری کالج کا درجہ ملا 1992ء میں پوسٹ گریجویٹ اور تب سے اب تک یہ پوسٹ گریجویٹ کالج کے طور پر قائم ہے۔ یاد رہے کہ اٹک ڈگری کالج پنجاب کے شمالی اضلاع میں راولپنڈی کے بعد مدت کے لحاظ سے قدیم ترین کالج ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ہمارے ایک ماموں مرحوم کیپٹن سید حلیم شاہ جو ضلع میانوالی کے گاؤں تبی سر (نزد شکر درہ ضلع کوہاٹ) کے رہائشی تھے وہ بھی اسی کالج میں 25-1924ء میں زیر تعلیم رہے تھے۔ ان دنوں کالج کی تعلیم تک بہت کم لوگوں کو رسائی ہوتی تھی علاقے کا تو مجھے پتہ نہیں لیکن اس کالج میں اپنے سیشن میں اپنے گاؤں کا واحد طالب علم تھا جو میٹرک کا امتحان پاس کر کے کالج میں داخل ہوا۔

کالج میں داخلہ:

گورنمنٹ ہائی سکول باہتر سے میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد میرے والد بزرگوار اور میرے بڑے بھائیوں کی خواہش پر مجھے گورنمنٹ کالج کیمبلپور (اب اٹک) میں داخل کرانے کا فیصلہ ہوا۔ والد بزرگوار کی ہدایت پر میرے بڑے بھائی سید محمد حسین شاہ مرحوم مجھے ساتھ لے کر اٹک کالج آئے یہاں کالج میں ان کے کوئی دوست تھے جو کالج کے سینئر طالب علم تھے ان سے مشورہ کر کے مجھے کالج میں داخل کرا دیا گیا۔ چنانچہ برادرم مجھے داخل کروا کر واپس آ گئے۔ گرما کی تعطیلات سے پہلے میرا داخلہ ہو گیا اور چار دن بعد ہمیں کالج سے

چھٹیاں ہوگئیں یہ چار دن میں اٹک کے قریب جی ٹی روڈ پر واقع قصبہ ہٹیاں میں اپنے دوسرے بڑے بھائی سید قربان حسین شاہ کے پاس رہائش پذیر رہا جو ان دنوں واپڈا میں ملازم تھے اور ہٹیاں میں رہائش پزیر تھے، ہٹیاں، کامرہ کے قریب اس مقام پر واقع ہے جو علاقہ چھچھ کے شہر حضرو کو جی ٹی روڈ سے ملاتی ہے علاقہ چھچھ اپنے تاریخی پس منظر کے لحاظ سے ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے وہاں کے لوگ خیبر پختون خوا کے ضلع صوابی سے ملحق ہونے کی وجہ سے نسلی لحاظ سے یوسف زئی پختون ہیں مگر یہاں کے لوگ پشتو اور ہندکو دونوں زبانوں سے مانوس ہیں۔

یہ غالباً جون کا مہینہ تھا۔ کالج میں چند روز حاضری کے بعد میں گھر واپس آ گیا اور اپنی باغ والی زمین میں گھر کے کام کاج میں اپنے بڑوں کا ہاتھ بٹاتا رہا۔ اسی دوران مجھے ٹانگ پر نارُو نکل آیا۔ نارُو ایک بیماری ہے جو ایک خاص قسم کا کیڑا جسم کے اندر منتقل ہوکر ٹانگوں میں پرورش پاتا ہے اور کچھ عرصے کے بعد جلد میں ظاہر ہوتا ہے۔ اگر اس کا علاج اور پیش بندی مناسب طریقے سے نہ ہو تو یہ پھٹ کر جسم میں زہر پھیلا سکتا ہے۔ یہ بیماری اُس وقت لکی مروت کے ضلع میں موجود تھی جبکہ میں نویں جماعت میں اپنے رشتہ داروں سے ملنے لکی مروت گیا تھا اور قریباً ایک ڈیڑھ ماہ وہاں گزار کے آیا تھا۔ کہتے ہیں کہ ''نارُو'' نام کا یہ کیڑا وہاں بنے تالابوں کے اندر پایا جاتا تھا جو پینے کے پانی کے ذریعے جسم میں داخل ہو جاتا تھا اور میرے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا ہمارے علاقے یعنی اٹک میں نارُو سے عدم واقفیت کی بناء پر اس کے علاج اور اس کے سنبھالنے میں لا پرواہی ہوئی ٹانگ میں زیادہ نقصان ہو جانے کی وجہ سے مجھے سول ہسپتال فتح جنگ میں داخل کروا دیا گیا جہاں پر ایک بنگالی (مشرقی پاکستانی) ڈاکٹر نے میری ٹانگ کا آپریشن کیا جہاں آپریشن کے بعد مجھے تقریباً ایک ماہ تک ہسپتال میں رہنا پڑا۔ نارُو کا علاج تو ہو گیا مگر ٹانگ میں زہر پھیل جانے کی وجہ سے یہ زخم مندمل ہونے میں کافی وقت لگا اور کافی عرصے تک میں لنگڑا کر چلتا رہا چنانچہ تعطیلات کے بعد جب میں دوبارہ کالج گیا تو کالج میں بہت کم شناسائی کی وجہ سے ابتدائی ایک دو ماہ تک لڑکے میرا نام لینے کے بجائے کہتے کہ فلاں جو تھوڑا سا لنگڑا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کی وجہ سے دو ماہ کے اندر میرا زخم بھی بھر گیا اور وہ لنگڑا پن بھی ختم ہو گیا۔

میرا داخلہ آرٹس کے مضامین میں ہوا اور برادرم مذکور نے ہی مضامین (Combination) کے انتخاب میں

میری راہنمائی کی اور میرے لئے انگلش، اردو لازمی مضامین کے علاوہ جغرافیہ، اکنامکس اور تاریخ اسلام جیسے مضامین منتخب کیے۔

جیسا کہ میں نے بتایا کہ کالج کے اندر میری شناسائی بہت کم لڑکوں سے تھی مگر آہستہ آہستہ دوستوں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا اور سال کے آخر تک اپنے کلاس فیلوز اور کالج فیلوز میں سے بیشتر طلباء کے ساتھ شناسائی اور پھر دوستی ہوگئی۔ کیمبلپور (اٹک) میں چونکہ اُس وقت لڑکیوں کا کالج موجود نہیں تھا اس لئے لڑکیاں بھی ہمارے ہی کالج میں پڑھتی تھیں ہماری کلاس میں لڑکیاں کافی تعداد میں تھیں مگر اُس وقت کالج میں لڑکوں اور لڑکیوں کے درمیان کافی حد تک Segrigation پائی جاتی تھی ان کا کامن روم بھی الگ تھا جہاں سے وہ گروپ کی شکل میں لیکچر زرومز آتیں اور وہیں سے واپس چلی جاتیں۔

کالج میں ہمارے چند اساتذہ:

پروفیسر سعداللہ کلیم:

اُردو کا مضمون ہمیں پروفیسر سعداللہ کلیم پڑھاتے تھے جو مقامی گورنمنٹ پائلٹ سیکنڈری سکول سے پروموٹ ہوکر کالج میں تعینات ہوئے تھے۔ ان کو اُردو کے مضامین پر عبور حاصل تھا اور ان کا لیکچر بڑا متاثر کن ہوتا تھا اور صرف یہی ایک مضمون تھا جس میں ہم پورے انہماک سے لیکچر سنتے تھے وہ بذاتِ خود ایک اچھے قلمکار اور شاعر تھے۔ کالج کے میگزین میں ان کی چھپی ہوئی غزل کے چند اشعار۔

ایسی بھری بہاروں میں بھی دل اتنا ویران کہ بس
کاغذ کے کچھ پھول ملیں تو اس کمرے کو سجا لُوں میں
دِل کے سارے زخم سجالُوں، سب اپنوں کو بُلالُوں میں
تجھ کو صدر نشیں کروں اور اِک شب جشن منا لُوں میں
صبح سے شہر میں گھوم رہا ہوں۔ شاید کوئی دوست ملے
تھوڑی دیر تو اپنے آپ سے اپنا آپ بچالُوں میں

انگریزی ابتدا میں ایک نوجوان پروفیسر ملک عبدالخالق صاحب پڑھانے لگے مگر جلد ہی وہ مقابلے

کے امتحان دے کر سول سروس میں منتخب ہو گئے یا شاید بیرون ملک چلے گئے اور ہمیں ایک اور سینئر استاد پروفیسر الطاف بیگ صاحب پڑھانے لگے۔ تاریخ اسلام ابتدا میں پروفیسر عجب خان پڑھاتے تھے مگر جلد ہی وہ تبدیل ہو کر کسی اور کالج چلے گئے اور تاریخ اسلام ایک پروفیسر زیدی صاحب پڑھانے لگے۔ تاریخ اسلام میں میری دلچسپی شروع ہی سے تھی اور میں نے ایف اے میں سب سے زیادہ نمبر تاریخ اسلام میں ہی لئے۔ اگرچہ تاریخ اسلام میں اُس وقت تک میرا مطالعہ پروفیسر ڈاکٹر عبدالحمید (جو غالباً پنجاب یونیورسٹی لاہور میں شعبہ تاریخ کے سربراہ تھے) کی کتاب تک محدود تھا تاہم لائبریری سے کبھی کبھی کوئی کتاب لے کر منہ کا ذائقہ تبدیل کر لیتے جغرافیہ کا مضمون ایف اے میں ہمیں پروفیسر ضیاء اللہ (علیگ) پڑھاتے تھے وہ علی گڑھ کے تعلیم یافتہ تھے۔ سر کے بالوں سے فارغ تھے اس لیے کبھی کبھی انگریزی لباس کے ساتھ سر پر انگریزی ٹوپی (ہیٹ) پہن کر آتے تو بالکل انگریز نظر آتے بھاری بھر کم ہونے کی وجہ سے گرمیوں میں کلاس میں لیکچر کے دوران سر کے پسینے کو اکثر رومال سے سمیٹتے رہتے تھے۔ کم گو ہونے کی وجہ سے طلبہ کے ساتھ ان کا ذاتی تعلق نہ ہونے کے برابر تھا۔ بی۔ اے یعنی سال سوم سے جعفرافیہ کا مضمون پروفیسر نقوی صاحب کے حوالے ہوا۔ نقوی صاحب ایک انتہائی خلیق مشفق اور مہربان پروفیسر تھا۔ سال بھر میں ایک روز بھی ان کے چہرے پر غصہ کے اثار نہیں دیکھے۔ ہندوستان کے کسی علاقہ سے ہجرت کر کے آئے تھے اور اٹک میں آباد تھے۔ اپنے آبائی علاقہ کی سیاہ اچکن اور پاجامہ زیب تن کرتے تھے۔

پروفیسر اشفاق علی خان:



کالج میں جب میرا داخلہ ہوا تو اس وقت پروفیسر اشفاق علی خان ہمارے کالج کے پرنسپل تھے۔ لباس اور وضع قطع کے لحاظ سے بالکل انگریز نظر آتے تھے وہ ہفتے میں ایک پیریڈ مشترکہ کلاس کا لیتے تھے اور یہ لیکچر بڑے ہال میں ہوتا تھا۔ پروفیسر صاحب انگلش کی کتاب کے کسی سبق سے لیکچر شروع کرتے اور پاکستان کی ''سٹیل مل'' پر ختم کرتے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ پروفیسر اشفاق علی خان ہی پاکستان کی وہ واحد شخصیت تھے جنہوں نے پاکستان سٹیل مل کی

اہمیت کو اُجاگر کیا۔ کہتے ہیں کہ وہ اس وقت کی مشہور انگریزی اخبار پاکستان ٹائمز اور ڈان وغیرہ میں الحمزہ کے قلمی نام سے مضامین لکھ کر ملک میں سٹیل مل کی اہمیت اُجاگر کرتے تھے اور اس وجہ سے لوگوں نے مذاق میں ان کا نام ہی ''سٹیل مل'' رکھ دیا۔ سنتے تھے کہ وہ مشہور ادیب اور انگریزی زبان کے ماہر پطرس بخاری کے شاگرد رشید تھے اور انہی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے وہ یہاں سے تبدیل ہو کر راولپنڈی، سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور اور آخر میں گورنمنٹ کالج لاہور جیسے نامی گرامی کالج کے پرنسپل ہو گئے۔ ان کی یہاں سے تبدیلی کے وقت میں غالباً کالج میں سوئم سال میں تھا آخری روز کالج کے تمام طالب علم انہیں الوداع کہنے ان کے بنگلے پر گئے۔ وہ ایک ایک طالب علم سے ہاتھ ملاتے تھے اور کوئی نہ کوئی مزاحیہ جملہ کہہ دیتے ایک طالب علم ہونے کی حیثیت سے ہم اُن کو اتنا قریب سے نہیں جانتے تھے مگر سنا تھا کہ اُس وقت کے صدر ایوب خان ان کو وقتاً فوقتاً ٹیلی فون کر کے ملکی معاملات پر ان سے مشاورت بھی کرتے تھے۔

ڈاکٹر غلام جیلانی برق



پروفیسر اشفاق علی خان کے علاوہ اٹک کے ایک اور بطل جلیل ڈاکٹر غلام جیلانی برق تھے۔ ان دونوں شخصیات کو ہم عہد ساز شخصیات کہہ سکتے ہیں اور ڈاکٹر غلام جیلانی برق مرحوم کو پاکستان کا ہر پڑھا لکھا فرد جانتا ہے۔ وہ 1901ء میں ضلع اٹک کے ایک گاؤں بسال میں پیدا ہوئے جہاں ان کے والد ایک مسجد کے پیش امام تھے۔ خود ڈاکٹر برق نے ابتدائی تعلیم دینی مدرسوں میں حاصل کی اور وہ ابتدائی زندگی میں (موجودہ دینی مدرسوں) کے ایک طالب علم کی مانند مسجد کی امامت بھی کرتے تھے مگر عصری تعلیم کی طرف راغب ہوئے تو ادیب فاضل (اُردو)، منشی فاضل (فارسی) اور مولوی فاضل (عربی) کے امتحان پاس کیے۔ 22 سال کی عمر میں میٹرک کا امتحان پاس کیا تو انگریزی تعلیم کی طرف راغب ہو گئے عربی اور فارسی کے ماسٹر امتحانات میں گولڈ میڈل لینے کے علاوہ آپ نے سینتیس 37 سال کی عمر میں پی ایچ ڈی کر لیا۔

ابتدا میں سکول ٹیچر رہے مگر 1934ء میں کالج میں عربی کے پروفیسر مقرر ہو گئے وہ بلا کے ذہین

تھےاوروسیع مطالعہ کے حامل تھے مطالعہ کے ساتھ تصنیف وتالیف کا کام بھی جاری رکھا۔آپ 'من کی دنیا'،'دو اسلام'،'دوقرآن'،''فرمانراویان اسلام''،''دانش عرب وعجم'' جیسی کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ڈاکٹر غلام جیلانی برق کی رہائش اٹک (کیمبلپور) میں تھی اور یہیں پر ہی وہ پروفیسر تعینات تھے۔ہمارے کالج میں داخلے کے وقت پروفیسری کی ملازمت سے ریٹائرڈ ہو چکے تھے۔مگر کبھی کبھی کالج کی تقریبات میں ان کو ضرور مدعو کیا جاتا وہ ریٹائرمنٹ کے بعد بھی کبھی کبھی کالج آ کر طلبہ کو لیکچر دیا کرتے تھےاسی طرح کے چند لیکچرز سے راقم بھی محظوظ ہوا مجھے یاد ہے کہ لیکچر کے دوران ان کے ہاتھ میں مشہور زمانہ میگزین (لائف LIFE) کا ایک پرچہ موجود تھا اور ہم پوری توجہ سے ان کا لیکچر سُن رہے تھے۔اپنی خالص ابتدائی دینی مدرسہ کی تعلیم اور خالص دینی گھرانے کے فرد ہونے کے برعکس وہ انگریزی لباس پہنتے تھے۔ان کی تصنیفات میں زیادہ تر دین سے متعلق کتب ہیں مگر انہوں نے ان کتب کو جدید اصولوں کے مطابق ریسرچ اور تحقیق کے مطابق تحریر کیا۔

سال سوئم میں جغرافیہ ہمیں نقوی صاحب پڑھاتے تھے۔ہمیں معلوم نہیں کہ وہ ہندوستان کے کونسے شہر سے ہجرت کر کے پاکستان آئے مگر خالص لکھنوی تہذیب کے نمائندہ فرد تھے سیاہ شیروانی اور سفید پاجامے میں ملبوس رہتے۔بی اے میں جغرافیہ کے مضمون میں طلبہ کی تعداد کم ہوگئی تو وہ اپنے دفتر میں بیٹھ کر ہی ہمیں لیکچر دے دیا کرتے تھے استاد اگر حلیم،مہربان اور مشفق ہوتا ہے تو نقوی صاحب سے بڑھ کر اس مثال پر کوئی پورا نہیں اتر سکتا تھا۔

معاشیات ابتداً (ایف اے) میں ہمیں پروفیسر نسیم شاہد صاحب پڑھاتے تھے معاشیات کی کلاس کافی بڑی تھی نسیم شاہد صاحب جب لیکچر شروع کرتے تو ان کے ابتدائی الفاظ یہ ہوتے ''تو آج ہم'' حیرانی کی بات ہے کہ وہ معاشیات اتنے دلچسپ انداز میں پڑھاتے کہ اس جیسا خشک مضمون اس وقت ہمارے لئے سب سے دلچسپ مضمون تھا لیکچرز میں بابائے معاشیات Adam Smith کی آبادی کے نظریہ Theory of papulation کو جس انداز سے تجزیہ کرتے وہ انہی کا خاصا تھا۔بی۔اے میں جانے سے پہلے پروفیسر نسیم شاہد کا یہاں سے تبادلہ ہوگیا تو بی۔اۓ میں پروفیسر نیر صاحب ہمیں پڑھانے لگے تو معاشیات کے مضمون میں ہماری دلچسپی نہ ہونے کی برابر رہ گئی۔

پروفیسر ظہور احمد (پرنسپل)



اپنے اساتذہ کے علاوہ کالج میں چند دیگر اساتذہ کا ذکر بھی ضروری ہے پروفیسر اشفاق علی خان کے بعد لیفٹننٹ کمانڈر (ریٹائرڈ) پروفیسر ظہور احمد ہمارے پرنسپل بنے وہ پاکستان نیوی کے ریٹائرڈ آفیسر تھے اور نظم وضبط کے پابند تھے وہ ایک بہت ہی نفیس انسان تھے ہم نے آخری سال میں ان سے فارسی آپشنل کا مضمون پڑھا جو شیخ سعدی کی حکایات پر مبنی ایک چھوٹی سی کتاب اور اس کا اُردو ترجمہ ہوتا تھا جس کے پورے سال میں ہم نے ان سے چند پیریڈ ہی پڑھا ہوگا بہر حال کالج کی ایڈمنسٹریشن ان کی بھی مثالی رہی اور کالج کی روایتی تقریبات سالانہ مشاعرہ، سالانہ مباحثہ (اردو، انگلش) اور دیگر تقریبات بڑے شوق سے منعقد ہوئیں۔

دیگر اساتذہ میں قاضی زاہد الحسینی جو اسلامیات پڑھاتے تھے ایک نہایت ہی معتبر دینی شخصیت اور دینی علوم کے ماہر تھے اٹک میں ان کا قائم شدہ مدرسہ اور ان کی دینی کتب ان کی یادگار ہیں۔ ہم نے تو ان سے براہ راست نہیں پڑھا مگر اسلامیات میں متعدد طلباء وطالبات ان کے شاگرد تھے۔

پروفیسر سعد اللہ کلیم اللہ کے علاوہ اردو کے ایک اور نامور استاد پروفیسر وقار بن الٰہی بھی ہمارے کالج میں استاد تھے۔ وہ اس وقت نوجوان تھے مگر علمی اور ادبی حلقوں میں ایک محقق اور افسانہ نگار کی حیثیت سے دور دور تک جانے پہچانے تھے۔ موٹریں اس وقت بہت کم ہوتی تھیں۔ وہ کالج میں ایک ویسپا سکوٹر پر آتے تھے سیاہ چشمے عموماً پہنتے اور اس میں کاؤبوائے لگتے تھے۔ اٹک کے مقامی رہائشی تھے ان کے والد اٹک کے مشہور وکیل تھے۔ ان کے ویسپا سکوٹر کے حوالے سے کسی طالب علم نے ان پر ایک مزاحیہ نظم بھی لکھی جو طلبہ میں بہت مشہور ہوئی بعد ازاں وہ کالج کے میگزین کے حصہ اُردو کے مدیر بھی رہے۔

سائنس کے اساتذہ میں کیمیا (کیمسٹری) کے پروفیسر احسان الحق انصاری صاحب تھے ان کا تعلق مشرقی پاکستان سے تھا مگر وہ کافی عرصہ سے اپنی فیملی کے ہمراہ یہاں مقیم تھے۔ ہمارے ٹیوٹوریل گروپ ''جی'' کے انچارج تھے میں اس گروپ کا مختلف سالوں میں سیکرٹری، وائس پریزیڈنٹ، خزانچی اور صدر رہا۔ لہٰذا ان کے ساتھ

کافی یادیں وابستہ ہیں پروفیسر اسماعیل صاحب ریاضی کے سنئیر پروفیسر تھے جو ہمارے بعد کالج کے پرنسپل بھی رہے بی۔اے میں ہمیں پروفیسر لطیف صاحب انگریزی پڑھانے لگے وہ بہت ہی دلچسپ اور طلبہ کے ساتھ گھل مل جانے والے تھے سردیوں میں کبھی کبھی ان کی کلاس میں ہی طلبہ سے چندہ جمع کر کے یا رضا کارانہ جرمانے کر کے چائے اور سموسوں کا اہتمام ہو جاتا تھا جس سے ہم بہت لطف اندوز ہوتے تھے۔

کالج میں علمی، ادبی اور سیاسی مشاغل:

کالج میں ہمارا پہلا سال بہت خاموشی اور تنہائی کی کیفیت میں گزرا ابتدا میں ہمارے گاؤں (لنگر) کے رہائشی ایک وکیل کے منشی قاضی غلام ربانی کے ساتھ شہر کے ایک حصے ''محلّہ چھوٹی روڈ'' کے ایک کرائے کے کمرے میں رہائش پزیر تھے اور رہائش سے ملحقہ ایک ہوٹل میں کھانے پینے کا بندوبست ہوتا تھا۔ ہوٹل کا مالک ایک بوڑھا شخص مستری بابا کہلاتا تھا جو ہمیں چائے اور روٹی نقد پیسوں پر مہیا کرتا تھا مجھے یاد ہے پورے دن کا چائے اور کھانا ایک یا ڈیڑھ روپے میں ہو جاتا تھا بابا کے ہوٹل میں گاہک بہت کم تھے مگر اسے چائے بنانے میں بہت مہارت حاصل تھی، بہر حال ایک سال کے بعد میرے ایک اور کزن سید حبیب اللہ شاہ کے کالج میں آجانے کے بعد ہم نے محلّہ بجلی گھر میں ایک اور کمرہ رہائش کے لئے کرائے پر لے لیا جہاں ہم کبھی خود کھانا پکاتے اور کبھی کسی ہوٹل پر ماہانہ کی بنیاد پر ادائیگی کر کے کھانا کھاتے اس کمرے میں میرے اور حبیب اللہ شاہ کے علاوہ کچھ اور دوست بھی رہائش پزیر رہے جن میں ہمارے گاؤں کے مسعود احمد (محکمہ لائیوسٹاک)، موضع کاہل / پنڈی گھیپ کے الف دین جو بعد میں آرمی کے ایجوکیشن برانچ میں بطور کرنل ریٹائرڈ ہوئے سائنس کے طالب علم تھے اور بلا کے پڑھاکو تھے۔ میں اور میرے کزن حبیب اللہ شاہ زیادہ مطالعہ اور پڑھائی کو صحت کے لئے مضر سمجھتے تھے مگر الف دین کے ساتھ ہمارا وقت بہت اچھا گزرتا تھا۔ میرے کزن حبیب اللہ شاہ اور ان کے درمیان خوب ہنسی مذاق اور ایک دوسرے سے چھیڑ چھاڑ چلتی رہتی تھی۔ تیسرے سال میں ہمارے ایک اور کزن سید بدر منیر شاہ بھی آگئے اور ہمارے ساتھ رہائش پزیر ہو گئے، بدر منیر شاہ ایک تندرست جسم کے خوبصورت نوجوان تھے پول والٹ کے نامی گرامی کھلاڑی تھے اور لاہور بورڈ میں کالج کی نمائندگی بھی کر چکے تھے میں غالباً بی۔اے کے تیسرے یا چوتھے سال میں تھا کہ ہمارے کالج کے سالانہ سپورٹس ڈے پر Pillow

fighting کے کھیل میں وہ میرے پارٹنر تھے پارٹنر اس طرح کہ انہوں نے مجھے اپنے کندھے پر اٹھایا ہوا تھا کیونکہ میں جسمانی طور پر ہلکا سا تھا Pillows روئی سے بھری ہوئی بوریاں ہاتھ میں لے کر اپنے مدمقابل سے لڑ رہا تھا یہ بہت ہی دلچسپ کھیل تھا جس میں کندھوں پر بیٹھے کھلاڑی آپس میں لڑ رہے ہوتے اور نیچے والے کھلاڑی اپنے جسمانی زور سے ایک دوسرے کو رنگ سے آؤٹ کرنے کی کوشش کرتے۔ یہ واحد کھیل تھا جس میں تمام تماشائی اپنے پورے جوش کے ساتھ اپنی پسند کی ٹیم کو داد دینے کیلئے رنگ کے اردگرد جمع ہو جاتے اور پوری دلچسپی سے شور شرابہ کرتے ہم نے ابتدائی مقابلے تو خوب کیے اور مدمقابل ٹیموں کو ہرا کر فائنل میں پہنچ گئے مگر آخری مقابلہ کافی دیر جاری رہنے کے باوجود ہم ہار گئے کیونکہ ہماری مدمقابل ٹیم کا نیچے والا کھلاڑی کافی زور آور تھا اور وہ میرے ساتھی (بدر منیر شاہ) کو رنگ سے دھکیل کر باہر نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔ یاد آیا کہ اس فائٹ میں اوپر والے کھلاڑی یعنی میرے مدمقابل شیخ خالد تھے جو میری طرح ہلکے پھلکے تھے اور بعد میں وہ پاکستان آرمی میں میجر تھے کہ پشاور میں میری ان سے ملاقات ہوئی تھی۔

؎ ''مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا''

بدر منیر شاہ کا ذکر میں نے تھا اور تھے کے صیغے میں کیا ہے اس لئے کہ میں ماضی کے قصے بیان کر رہا ہوں۔ برادرم بدر منیر شاہ کافی عرصے سے علیل ہیں مگر اللہ کے فضل سے بحیات ہیں۔ اس طرح سپورٹس ڈے پر دیگر کھیلیں مثلاً سائیکل ریس، لانگ جمپ، ہائی جمپ، لانگ ریس، شارٹ ریس، وغیرہ کھیلیں بھی خوب شوق سے کھیلی اور دیکھی جاتیں کالج سے باہر کالج گراؤنڈ میں مختلف تماشائیوں کے لئے ٹینٹ لگائے جاتے اور طلباء کے ساتھ طالبات کا علیحدہ ٹینٹ بھی موجود ہوتا اور سٹیج سے دلچسپ کمپیرنگ کے ساتھ ساتھ مائیک پر ریکارڈ پلیئر (ٹیپ ریکارڈ) کے ذریعے اس وقت کے مشہور انڈین اور پاکستانی گانے سنانے کا بھی اہتمام بدرجہ اتم موجود ہوتا

؎ ''اُس بے وفا کا شہر ہے اور ہم ہیں دوستو''

جیسے گانے ہماری جوانی کے خون کو گرمانے کا اک بہانہ بن جاتے۔ علاقے کے مختلف کالجز کے درمیان سالانہ ٹورنامنٹ بھی بڑے تزک و احتشام سے منائے جاتے۔ ایک کھیل کے ٹورنامنٹ عموماً ایک کالج میں کروائے جاتے ہمارے کالج کے حصے میں ہاکی کا کھیل آتا کیونکہ ہمارے کالج کی ہاکی ٹیم مانی ہوئی ٹیم

تھی اس کوٹورنامنٹ میں باہر سے کھیلنے کے لئے گورنمنٹ کالج راولپنڈی، گارڈن کالج راولپنڈی، گورنمنٹ کالج میانوالی اور کئی دیگر ٹیمیں ہمارے کالج آتیں اور یہ ٹورنامنٹ کئی روز جاری رہتا۔ کالج کے طلبہ کو ان دنوں تماشائی کی حیثیت سے شامل ہونے کی پوری آزادی ہوتی، خاص کر کالج کی اپنی ٹیم کے میچ کے روز اپنی ٹیم کی حوصلہ افزائی کے لئے پورے جتن کیے جاتے۔ کالج کے منچلے رنگا رنگ نعرے ایجاد کرتے اور زندہ باد'' اور ٹھاہ ٹھاہ'' کے نعرے پورے زور سے وشور سے سنائی دیتے۔ کالج میں سپورٹس ڈے اور ٹورنامنٹ کی تقریبات کے علاوہ سالانہ تقریری مقابلے (Debate) سالانہ مشاعرہ اور فی البدیہہ تقاریر کے مقابلے بھی منعقد کروائے جاتے ان تقاریب کا ہمیں کئی دن سے انتظار رہتا اور پھر یہ دن بھی آجاتے۔ یہ مقابلے عموماً راتوں کو ہوا کرتے کبھی کبھی دن کو بھی تقریب رکھ لی جاتی ان مقابلوں میں شرکت کے لئے لاہور، فیصل آباد، میانوالی، راولپنڈی اور پشاور سے بھی ٹیمیں آتیں۔ ہمارے ایک کزن سید الطاف حسین شاہ جو اسلامیہ کالج کی خیبر یونین کے صدر بھی رہے اور ہم سے سینئر تھے اکثر ان مقابلوں میں شرکت کرنے کیمبلپور آتے ہم خود تو نہ شاعر تھے اور نہ کوئی مقرر مگر دیگر طلبہ کی طرح ان تقریبات کا بڑے ذوق وشوق سے انتظار کرتے اور مشاعروں کے انعقاد کے بعد ہم بھی کئی روز تک طرح مصرعہ پر طبع آزمائی کرتے رہتے۔ مگر

نہ ہوا پر نہ ہوا میرؔ کا انداز نصیب
ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

نتیجہ: وہی ڈھاک کے تین پات...... پوری کالج لائف میں ہم ڈھنگ کی ایک غزل بھی نہ لکھ سکے

کالج میگزین اور ہماری پہلی باقاعدہ مطبوعہ تحریر:

کالج کی جملہ یادگاروں میں شامل کالج میگزین کے چھپ کر آنے میں بھی ہمیں اُسی شوق اور تجسس سے انتظار رہتا۔ اس سلسلے میں ایک واقع نہیں بھولتا پہلا سال تو ویسے ہی گزر گیا مگر کالج کے دوسرے سال تک کالج کی مختلف مضامین کی سوسائیٹیوں اور بزم ادب کی تقریبات میں بارہا شمولیت کرتے کرتے ہماری ادبی یا قومی حسِ بھی جاگ اُٹھی تھی۔

راقم کالج میں اپنے ٹیوٹوریل گروپ جی (Gentlemen) کا سیکرٹری منتخب ہو گیا کالج کی کسی

نہ کسی سرگرمی میں حصہ لینے کی خواہش رہنے لگی دوسرے سال کیلئے کالج میگزین کے آئندہ شمارے میں مضامین لکھنے کی دعوت عام کا نوٹس لگا تو ہماری بھی رگِ اظہارِ خیال پھڑکی۔ چند دن کے سوچ بچار کے بعد ہم نے بھی ایک مضمون لکھ مارا اور کالج میگزین ''مشعل'' کے سٹوڈنٹ ایڈیٹر یا چیف ایڈیٹر کے حوالے کردیا مضمون کا عنوان تھا ''اسلامی نظام حیات پر ایک نظر'' اس دوران کالج میں مضمون نویسی کا ایک مقابلہ منعقد ا ہوا جس میں راقم الحروف بوجوہ شرکت نہ کرسکا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہمارا تجسس بڑھنے لگا کہ ''مشعل'' میگزین کیلئے لکھے گئے میرے مضمون کا کیا بنا۔ کچھ عرصے بعد کچھ مصدقہ ذرائع سے یہ خبر ملی کہ میگزین کے لئے انتخاب میں آپ کا مضمون تو منتخب نہ ہوسکا البتہ ایک سینئر طالب علم (جو غالباً میگزین کے سٹوڈنٹ نائب ایڈیٹر بھی تھے) کا اس موضوع پر مضمون منتخب ہوگیا ہے یہ خبر میرے لئے پریشان کن تو تھی مگر ایک گمنام قسم کے طالب علم کی حیثیت سے اس کے خلاف احتجاج یا شکایت کا کوئی طریقہ مجھے نہیں سُوجھا۔ البتہ اپنے ٹیوٹوریل گروپ کے ایک سرگرم رکن ''احسن حجازی'' (احسن الدین شیخ ایڈوکیٹ) (جو بعدازاں اٹک کے نامور وکیل بنے) کے مشورے سے میں نے اپنے ٹیوٹوریل گروپ کی ہفتہ وار میٹنگ میں احتجاج کی شکل میں اس کا تفصیل سے ذکر کردیا۔ احسن حجازی کے پرزور احتجاج پر ہمارے ٹیوٹوریل گروپ کے انچارج احسان الحق انصاری صاحب (مشرقی پاکستانی/ بنگالی) نے اس کا نوٹس لے لیا اور انہوں نے میری شکایت میگزین کے چیف ایڈیٹر پروفیسر وقار بن الٰہی صاحب تک پہنچادی۔


شیخ احسن الدین ایڈوکیٹ (احسن حجازی)

پروفیسر وقار بن الٰہی ہمارے کالج کے اردو کے پروفیسر اور ایک نامی گرامی ادیب، افسانہ نگار کی شہرت کے حامل تھے ایک دن کالج کی راہداری میں اچانک ان کے ساتھ آمنا سامنا ہوگیا مجھے دیکھ کر اچانک رُکے اور مجھے مخاطب ہوکر بولے ''بخاری!'' وہ تمہارا مضمون میں نے مشعل میں پرنٹنگ کے لئے دے دیا ہے'' پروفیسر وقار بن الٰہی کے منہ سے پہلی مرتبہ اپنا نام اور لفظ بخاری کے ساتھ مضمون چھپنے کی خبر سن کر تو مجھ پر

شادی مرگ کی کیفیت طاری تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں نے ان کا شکریہ کیسے ادا کیا۔ البتہ ٹیوٹوریل گروپ کی اگلی میٹنگ میں مَیں نے اپنے گروپ ممبرز کو خوشخبری سنائی اور گروپ انچارج پروفیسر احسان الحق صاحب اور احسن حجازی صاحب کا کھل کر شکریہ ادا کیا۔ مشعل کا سالانہ شمارا چھپ کر آیا تو اپنا مضمون اپنے نام کے ساتھ دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے مجھے کوئی بڑا خزانہ ہاتھ لگ گیا ہو۔ تو یہ میری پہلی باقاعدہ تحریر ہے جو صفحہ قرطاس پر چھپی اور ایک بڑے جریدے کا حصہ بنی۔

کالج کی سٹوڈنٹس یونین:



سیدزاہدحسین بخاری ایڈووکیٹ

کالجوں میں سٹوڈنٹ یونین ہی وہ تنظیم ہوتی ہے جس کے ذریعے نوجوان نسل اپنا آپ اظہار کرسکتی ہے یونین اپنے کالج کے اندرونی مسائل پر بھی طلبہ کی ترجمان ہوتی ہے اور بیشتر اوقات قومی مسئلوں پر بھی دیگر تنظیموں کی پیش رَو اور ہراول دستے کا کردار ادا کرتی ہے۔ دیگر اداروں کی طرح ہمارے کالج میں بھی کئی سالوں سے مارشل لاء حکومتوں کی وجہ سے پابندی عائد تھی مگر کالج میں ہمارے آخری سال میں یا ایک دو سال پہلے نہ جانے کس قانون کے تحت پابندی ہٹ گئی اور کالج کی یونین کے باقاعدہ انتخابات کا انعقاد کیا گیا۔ ہم سال چہارم کے طالب علم تھے اور انتخابات کے ضوابط کے تحت سال چہارم کا طالب علم یونین کی صدارت کا انتخاب لڑنے کا عہدیدار ہوسکتا تھا سال سوئم سے شاید نائب صدر اور سال دوئم سے جنرل سیکرٹری اور اسی طرح دیگر عہدوں کے لئے طلبہ انتخاب لڑنے کے اہل تھے اتفاق سے صدارت کے لئے ہم نے ایک ہم جماعت کزن سید زاہد حسین بخاری کو یونین کی صدارت کے لئے کھڑا کیا۔ انتخابات میں ہماری زیادہ دلچسپی فطری بات تھی کہ ہمارے کزن امیدوار تھے۔ انتخابات کی مہم کی اجازت اگرچہ چند روزہ تھی مگر خوب زور شور سے چلی مقابلے میں صدارت کے لئے دو ہی امیدوار تھے سید زاہد حسین بخاری اور شیخ فریدالدین کا تعلق شہر کی شیخ برادری سے تھا جو ہر لحاظ سے ایک موثر کمیونٹی تھی۔ زاہد بخاری بھی اگرچہ شہر میں اپنے بڑے بھائی سید ایوب بخاری کے ساتھ رہائش پزیر تھے مگر ان کا تعلق نواحی گاؤں بُوٹا سے ہونے

کی وجہ سے وہ دیہی پس منظر کے حامل تھے اتفاق سے یہ الیکشن کسی نظریاتی پس منظر کی بجائے شہری اور دیہی پس منظر کے تناظر میں لڑا گیا ہمارے کزن سید زاہد بخاری بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئے اور بعدازاں ہم یونین کی سرگرمیوں میں ان کے شانہ بشانہ رہے جیسا کہ پہلے بتا چکا ہوں کہ کالج کے پرنسپل پروفیسر ظہور احمد چونکہ پاکستان نیوی کے ریٹائرڈ افسر تھے لہذا کالج میں ان کا عسکری پس منظر نمایاں رہتا۔ یونین کی سرگرمیوں کو کامیابی سے چلانے کیلئے پراکٹرز کی بڑی اہمیت ہوتی ہے پرنسپل نے پراکٹرز کو سٹیورڈز کا نام دے دیا چنانچہ ہم بھی پراکٹر کی جگہ سٹیورڈ کے نام سے خدمات انجام دیتے رہے (اور اسی عہدے سے کالج سے باعزت ریٹائر ہوئے)۔

کالج لائبریری اور ریڈنگ روم:

قدیم کالج ہونے کے حیثیت سے کالج کے اندر ایک ضخیم لائبریری بھی موجود تھی جو اگرچہ مختلف مضامین پر مبنی کتب سے بھری ہوئی تھی مگر چونکہ طلبہ کیلئے ترغیب کا کوئی موثر ذریعہ موجود نہیں تھا اس لئے ہمارے سمیت بہت کم طلبہ اس لائبریری سے مستفید ہوتے البتہ آخری دو سالوں میں ہم درسی کتب کے علاوہ لائبریری سے بھی کچھ کتابیں جاری کروا کر پڑھ لیتے۔ ایک قابل ذکر بات یہ کہ کالج کے لائبریرین کے دفتر میں اکثر اوقات پروفیسر حضرات کا جھمگٹا ضرور دیکھا جاتا ہمارے علم میں بہت دیر بعد یہ بات آئی کہ ہمارے کالج کے محترم لائبریرین جناب نذر صابری بذات خود ایک ادیب شاعر اور علم دوست شخصیت ہیں اور ان کا واضح رجحان تصوف کی طرف تھا۔ علم وادب اور تصوف میں ان کی دلچسپی کی وجہ سے کالج میں انہوں نے نوادارات علمیہ اٹک کے نام سے ایک تنظیم قائم کر رکھی تھی جس کے تحت نوادرات کی کئی نمائشوں کا اہتمام ہوتا۔

ریڈنگ روم:۔

ریڈنگ روم بھی لائبریری کے ساتھ ایک ملحقہ کمرے میں قائم تھا جس میں اس زمانے کے مشہور ومعروف اخبارات اور جریدے موجود ہوتے مجھے چند ایک جریدوں کے نام اب بھی یاد ہیں جنہیں ہم فارغ پیریڈ میں پڑھ کر اپنے ذوقِ مطالعہ کی تسکین کر لیتے ان میں مولانا سید ابوالاعلی مودودیؒ کا ''ترجمان القرآن''، غلام احمد پرویز کا ''طلوع اسلام''، شیعہ مکتب فکر کا ترجمان رسالہ، انگریزی جریدے لائف ٹائم، اور کئی ایسے

جریدے جن کے نام اب ذہن میں محفوظ نہیں رہے ہمارے کالج کے ریڈنگ روم کی زینت ہوتے تھے روزنامہ اخبارات میں نوائے وقت، جنگ، کوہستان؛ تعمیر کے علاوہ چند اور اُردو اخبارات اور چند انگریزی اخبارات بھی ریڈنگ روم میں میز پر بکھرے ہوتے یا ریڈنگ روم کے باہر برآمدے میں لگائے گئے ایزل میں نصب ہوتے جہاں کھڑے ہوکر اخبار پڑھنے کی سہولت بھی موجود ہوتی۔ ہمارے کالج میں سالِ دوئم تک بھارت سے بھی چند جریدے آتے تھے جو 1965ء کی جنگ کے بعد بند ہوگئے۔ ریڈنگ روم کے بالکل سامنے کچھ فاصلے پر طالبات کا کامن روم واقع تھا جہاں سے طالبات کا مختلف پریڈز کیلئے گروپوں کے شکل میں آنا جانا لگا رہتا تھا چنانچہ کچھ منچلے ریڈنگ روم کے اندر بیٹھ کر کتابوں اور رسائل سے محظوظ ہونے کے بجائے ریڈنگ روم کے باہر کھڑے ہوکر طالبات کے گروپوں کی آمدورفت کے نظاروں سے اپنی آنکھوں کو ٹھنڈک اور دل کو راحت کا سامان مہیا کرتے رہتے۔ تاہم حرف آخر کے طور پر کہوں گا کہ ہمارے اندر علم وادب کے ذوق کا جو قلیل سرمایہ موجود ہے اس میں زیادہ تر حصہ اسی کالج لائبریری اور ریڈنگ روم کا ہے۔

28 فروری 2017ء

آج 28 فروری 2017 ہے اور میں نے اپنی زندگی کے 70 ستر سال پورے کر لیے ہیں۔کل میری 70 ویں سالگرہ ہے میری زندگی کے یہ ستر سال کیسے گزرے یہ ایک لمبی کہانی ہے مگر اختصار کے ساتھ ایک جائزہ لے لیا جائے تو کیسے رہیگا؟ آپ جانتے ہیں کہ آج کل نیٹ اور سوشل میڈیا کا دور دورہ ہے۔ایک دلچسپ کہاوت جو حال ہی میں ''واٹس ایپ'' پر نشر ہوئی ہے کچھ اس طرح ہے۔

What is Success

1. At the age of 4years......Success is that you do not urinate in your pants
2. At the age of 8 years........Success is To know the way back home
3. At the age of 12 years........Success is ....To have friends
4. At the age of 18 years........Success is to get a driving license
5. At the age of 23 years....Success is----- to graduate from a University
6. At the age of 25 years........ Sucess is to get a job
7. At the age of 30 years........ Success is .... to be a family man
8. At the age of 45 years........ Success is to maintian the apperance of a young man.
9. At the age of 50 years........ Success is to provide good education for your chlidren
10. At the age of 55 years........ Success is .... to still be able to perform your duties well
11. At the age of 60 years........ Success is to still be able to keep driving
12. At the age of 65 years........ Success is to live without disease.
13. At the age of 70 years....Success is to not to be a burdone on anyone
14. At the age of 75 years........Success is .... to have old friends.
15. At the age of 80 years......Success is ......to know the way back home.
16. At the age of 85 years........Success is ....not to urimate in your paints again.

Life is Cycle.

ایک مشہور ضرب المثل ہے''زندگی موت کی امانت ہے'' مطلب یہ ہے کہ جو شخص دنیا میں آیا اُسے

بہرحال کسی نہ کسی وقت اپنے آپ کو موت کے حوالے کرنا ہوتا ہے۔ زندگی کتنی ہوتی ہے اس کا کچھ پتہ نہیں بعض روایات میں پیغمبروں کی عمریں 100 سال سے 1000 سال تک بتائی جاتی ہیں اور موجودہ دور میں 100 اور 120 سال سے زائد عمر کے لوگ موجود ہیں۔ کامیاب زندگی اور ناکام زندگی کے مختلف لوگوں کے مختلف میعارات ہیں۔ ایک اور کہاوت ہے۔ ''بندہ آمداز برائے بندگی۔ زندگی بے بندگی شرمندگی''۔ اور اسی نظریہ کے مطابق لوگ زندگی کی کامیابی کو اللہ تعالیٰ سے قربت اور تقویٰ و پرہیز گاری سے منسوب کرتے ہیں۔

جان دی، دی ہوئی اُسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

اللہ تعالیٰ کے فرستادہ پیغمبروں، ان کے صحابہ کرامؓ، اہل بیت اطہارؓ، اولیا کرام اور دنیا میں بھیجے گئے برگزیدہ بندوں نے بھی زندگی کا مقصد اور کامیابی تقویٰ اور اللہ کی عبادت کو ہی قرار دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی بھیجی گئی آخری کتاب میں **اِنَّا اَکْرَمَکُم عِندَاللّٰہ اَتقَکُم** (بے شک تم میں افضل وہی ہیں جو جتنے متقی اور پرہیز گار رہیں)۔ بجا طور پر زندگی میں کامیابی کا میعار تقویٰ، پرہیز گاری اور سچائی و پاکیزگی کو ٹھہرایا ہے۔

کامیابیوں کے ان تمام میعارات کے باوجود زندگی کی سب سے بڑی کامیابی اللہ کی دی ہوئی زندگی کو اللہ کی راہ میں اللہ کے دین کی حفاظت اور اُسے بچانے کے لیے زندگی کو قربان کر دینے میں ہے۔ اس مقصد کے لیے مسلمانوں نے جہاد کے ذریعے اپنے دین کی حفاظت کے لیے اپنی زندگیاں قربان کیں۔ حضرت امام حسینؑ کی کربلا کے صحرا میں اپنی اور اپنے اہل وعیال کی قربانی اس کی بہترین مثال ہے اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب میں ایسے لوگوں کی کامیابی کا اعلان یہ کہتے ہوئے کیا گیا ہے کہ ''ایسے لوگوں کو مردہ مت کہو بلکہ یہ زندہ ہیں مگر تم اس کا شعور نہیں رکھتے ہو''۔

راقم ایک مسلمان ہوتے ہوئے یقین رکھتا ہے کہ زندگی کی کامیابی کا راز زندگی دینے والے کے احکامات کی پابندی اور اس کے حبیب پاک ﷺ کی محبت اور اس کی سنت پر چلنے میں ہے۔ تاہم مندرجہ بالا انگریزی عبارت میں ہلکے مزاح اور دنیوی زندگی کو سامنے رکھ کر کامیابی کے جو میعارات بتائے گئے ہیں ان کے مطابق اپنی زندگی کا جائزہ لیتے ہیں۔

☆ چار سال کی عمر میں ان کے مطابق کامیابی کا راز اس میں ہے کہ آپ اپنی شلوار میں پیشاب نہیں کرتے تو اگر چہ مجھے اپنی چار سال کی زندگی کے بہت ہی کم واقعات یاد ہیں مگر مجھے اپنے بڑوں کی باتیں سُن کر اپنے بارے میں اتنا یقین ہے کہ چار سال کی عمر میں میں اپنے آپ کو سنبھال چکا تھا۔ بلکہ ایک واقعہ یاد آیا میں چوتھی جماعت میں بیمار ہو گیا کئی روز تک بستر علالت پر رہا عمر تو اس وقت دس گیارہ برس تھی مگر بستر پر ہونے کی وجہ سے میری والدہ مرحومہ کو پیشاب کے لئے اٹھنے کے اوقات کا اندازہ ہوا تو انہوں نے ایک دن بڑی حیرانگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ مجھے تو سمجھ نہیں آتی کہ یہ پیشاب کے لئے کس وقت اٹھتا ہے۔ اور اللہ کے فضل سے آج اس عمر میں بھی میں ظہر کی نماز کے لئے وضو کرتا ہوں تو عصر، مغرب اور عشاء کی نمازیں بھی اُسی وضو میں باسانی ادا کر سکتا ہوں تو اندازہ ہوا ہماری کامیاب زندگی کا؟

☆ آٹھ 8 سال کی عمر میں کامیابی یہ ہے کہ آپ کو اپنے گھر واپس آنے کا راستہ معلوم ہو۔ مجھے پانچ یا چھ سال کی عمر کا ایک واقع یاد آ گیا کہ میں اپنی والدہ کی اجازت کے بغیر اپنے گاؤں کے ایک دوست لڑکے (جو مجھ سے عمر میں تھوڑ بڑا تھا) پورا گاؤں کراس کر کے گاؤں کے مشرقی جانب کھیتوں سے ہوتا ہوا نالہ نندنا کے ساتھ بنائے گئے کنوؤں (رہٹ) والی زمینوں تک چلا گیا اُس لڑکے کے والدین اس علاقے میں کھیتی باڑی کرتے تھے اور وہ ان راستوں سے مانوس تھا مگر میں اپنی زندگی میں پہلی دفعہ اس علاقے میں گیا تھا۔ ہوا یہ کہ میں کسی طرح اس لڑکے سے بچھڑ گیا اور اکیلا ہی واپس گھر کی طرف چل پڑا۔ ناہموار راستوں سے عدم واقفیت اور اوپر سے اکیلا پن۔ میں واپس بھی رواں دواں تھا اور رو بھی رہا تھا۔ 3,2 کلومیٹر کا یہ راستہ میں نے روتے ہوئے طے کیا اور خوش قسمتی سے میرا رُخ گاؤں کی طرف ہی تھا۔ بہر حال گاؤں کے قریب پہنچ کر مجھے ڈھارس ملی اور میں گاؤں کی گلیاں کامیابی سے عبور کر کے اپنے گھر پہنچ گیا۔ گھر میں تو مجھ سے کسی نے نہ پوچھا اور نہ ہی ڈر کے مارے میں نے اپنے مہم جوئی کے بارے میں خود کسی کو بتایا۔ اور ہاں 8 سال کی عمر میں تو ماشاء اللہ مجھے سکول جاتے ہوئے بھی دو سال ہو چکے تھے۔ میرا گھر گاؤں کے بالکل آخری شمالی حصے میں تھا اور سکول بالکل جنوبی محلے میں اور بعض اوقات میں اکیلا بھی گھر آ جاتا تھا۔

☆ 12 سال کی عمر میں کامیابی یہ ہے کہ آپ نے دوست بنا لیے ہوں۔ بارہ سال کی عمر میں دوست بنا لینا اگر کامیابی ہے تو اس امتحان میں بھی راقم کامیاب ہے۔ بارہ سال کی عمر میں راقم شاید چھٹی یا ساتویں کلاس میں پڑھتا تھا جبکہ راقم کے تو پرائمری سکول کے دوران ہی دوست بن چکے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ گرمیوں کی طویل دوپہروں میں جب کہ گھر سے نکلنے کی اجازت نہ ہوتی اور گرما کی تعطیلات کی وجہ سے سکول میں بھی دوستوں سے ملاقات ممکن نہیں نہ ہوتی تھی تو دن ڈھلتے ہی بے چینی سے انتظار ہوتا کہ کسی طرح کوئی دوست آجائے تاکہ بقیہ وقت اس کے ہمراہ ہنسی کھیل میں گزر جائے۔

☆ ممتحن بتاتا ہے کہ 18 سال کی عمر میں آپ تب کامیاب کہلائیں گے جب آپ نے ڈرائیونگ لائسنس حاصل کرلیا ہو۔تو محترم ممتحن صاحب ''چو ہالنڈ ورا ہی بھلا''۔کہاں کی ڈرائیونگ اور کہاں کا لائسنس۔ اٹھارہ سال کی عمر میں ہم انٹر کلاس میں پڑھتے تھے اور بڑی مشکل سے کالج سے فارغ ہوکر کرائے پر سائیکل لے کر ہم نے اپنے دوستوں کی مدد سے سائیکل ڈرائیونگ سیکھی۔تو جناب ہمارا ڈرائیونگ سیکھنا ہی ہمارا لائسنس تھا اور آپ کے علم کے لیے کہ گدھا گاڑی چلانے کے لئے لائسنس تو کیا اس کی چالان کا بھی آج تک کوئی قانون نہیں ہے جبکہ پٹرول میں آئے روز کی مہنگائی کی وجہ سے چنگ چی کے آگے گدھا باندھی ہوئی گاڑیاں اب سڑکوں پر عام نظر آتی ہیں۔

☆ 23 برس کی عمر میں یونیورسٹی سے گریجویٹ ہو جانا اگر کامیابی ہے تو جناب ہم نے اس میں سو بٹہ سو نمبر لے لیے۔بیس سال میں تو ہم نے ایک ہی یونیورسٹی سے ڈبل گریجویشن یعنی بی-اے اور ایم-اے دونوں کر لیے تھے۔

☆ 25 سال کی عمر میں اگر برسر روزگار ہو جانا کامیابی ہے تو ہم 23 سال کی عمر میں وطن عزیز میں تدریس کے سرکاری شعبہ میں باتنخواہ شامل ہو چکے تھے۔اگرچہ اپنے دور کے رواج یا مجبوری کے تحت ہم اپنی تعلیمی قابلیت کے مطابق جاب حاصل نہ کر سکے تاہم دوسال بعد یعنی 25 سال میں ہم ماشاءاللہ پوری طرح برسر روزگار ہو چکے تھے۔

☆ پھر فرماتے ہیں کہ ''تیس سال'' کی عمر میں کامیابی یہ ہے کہ آپ ایک ''فیملی مین'' بن چکے ہیں۔فوج کی

اصطلاح میں تو فیملی مین اس فوجی کو کہتے ہیں جو فوج میں اپنی ڈیوٹی کے دوران اپنی اہلیہ کو ساتھ رکھتے ہیں اور اس مقصد کے لیے فوج انہیں باقاعدہ گھر مہیا کرتی ہے اور دیگر سہولیات وغیرہ بھی۔ مگر یہاں ہمارے ممتحن صاحب کا فیملی مین سے مراد شادی شدہ ہونا ہے، تو جناب ہم اس امتحان میں بھی کامیاب ہو گئے کیونکہ ممتحن صاحب کی 30 سال کی عمر کی شرط سے دو سال قبل یعنی 28 سال کی عمر میں ہم یہ امتحان دے چکے تھے۔ رہ گئی کامیابی اور ناکامی کا سوال تو ہمارا ہمارے ادیبوں، مزاح نگاروں اور سوشل میڈیا کے ماہرین نے اس کے مختلف جوابات دیے ہیں۔ حتیٰ کہ سنجیدہ ادیبوں اور افسانہ نگاروں نے شادی کو ''محبت کی موت'' سے تعبیر کیا ہے۔

☆ 45 سال کی عمر میں اگر آپ جوان دِکھتے ہیں تو آپ کا شمار کامیاب انسانوں میں ہوگا۔ اب اس امتحان کا نتیجہ تو وہی شخص بتا سکتا ہے جس نے ہمیں 45 سال کی عمر میں دیکھا ہے۔ ویسے ہم تو آج بھی ہیئر کلر کا سہارا لے کر اپنے آپ کو کامیاب انسان کہلوانے کی پوری کوشش کرتے ہیں۔

☆ 50 سال کی عمر کا کامیاب انسان وہ ہے جس نے اپنے بچوں کو اس عمر تک اچھی تعلیم کے زیور سے آراستہ کر دیا ہو۔

حساب لگایا گیا تو پتہ چلا کہ ہم تو پچاس سال کے ہو گئے مگر دونوں بیٹوں نے ابھی تک گریجویشن مکمل نہیں کی۔ پھر حساب لگایا کہ کسی کلاس میں فیل بھی نہیں ہوئے تو پتہ چلا کہ یہاں پر ممتحن صاحب خود غلط ہو گئے یا ان کی نظر میں بچوں کی اچھی تعلیم کا مطلب کچھ اور ہے میڈیکل اور انجینئرنگ کی تعلیم ڈبل گریجویشن کے برابر ہوتی ہے جو والدین کی پچاس سال کی عمر میں ناممکن ہے۔

☆ 55 سال کی عمر میں کامیابی یہ ہے کہ آپ ابھی تک اپنی ڈیوٹی بطریق احسن سرانجام دے رہے ہیں۔ تو بھائی ہم نے تو اپنی معمول کی سرکاری ڈیوٹی کے علاوہ کئی اور غم بھی پال رکھے ہیں اور سرکاری ڈیوٹی کے بھی عروج کے سال ہیں۔ ابھی تک ہماری جبری ریٹائرمنٹ (60 سال) میں بھی پانچ سال رہتے ہیں۔ لوگ آج ستر سال کی عمر میں ہماری کارکردگی کو سراہ رہے ہیں۔

☆ جناب فرماتے ہیں کہ 60 سال کی عمر تک اگر آپ صحیح ڈرائیونگ کر سکتے ہیں تو آپ کامیاب انسان

ہیں۔ ممتحن صاحب کی ڈرائیونگ سے مراد اگر ہوائی جہاز کی ڈرائیونگ نہیں ہے تو ہم تو ستر سال کی عمر میں بھی پانچ چھ گاڑیاں پرانی کر چکے ہیں اور اب تو گاڑیاں بھی آٹو میٹک ہیں، خود بخود چلتی ہیں۔

☆ 65 سال کی عمر میں بیماریوں کے بغیر جینا ایک کامیابی ہے۔ مگر شاید ہی کوئی ایسا شخص ہو جسے 65 سال تک کوئی بیماری نہ لگی ہو۔ ہاں مگر ہمارا تو ایمان ہے ''واذا مرضت فهو يشفين '' جو بیماری دیتا ہے وہ شفا بھی دیتا ہے اس معاملے میں تو ایک پورا مضمون تالیف ہذا میں موجود ہے۔

☆ 70 سال کی عمر میں کامیابی یہ ہے کہ آپ دوسروں پر بوجھ نہیں ہیں۔ نہیں جناب اگر آپ نے زندگی میں کوئی ملازمت کی ہے اور وہ بھی سرکاری ملازمت تو بھلا ہو پینشن کا قانون بنانے والوں کا۔

سرکاری ملازم 60 سال کی عمر میں پنشن لے کر فارغ ہو جاتا ہے۔ 70 سال تک کوئی دس مرتبہ اس کی پینشن میں اضافہ ہو چکا ہوتا ہے۔ تو دوسروں پر بوجھ کیسے؟ بال بچوں، شادی بیاہ، گاڑی، مکان اور تمام ضروریات زندگی اس شخص کو اولاد بھی حسرت سے دیکھ کر سوچتے ہیں کہ بابا اتنے زیادہ پیسے کہاں خرچ کرتا گا مگر ہاں بہت سے بابے اپنی خفیہ دولت (ماہوار پنشن) کو اپنے آپ کو "بیچارہ ریٹائرڈ" کہ کر حرص بھری نظروں سے سے بچانے کی کوشش کرتے ہیں اور ادھر کئی "اہل خانہ بابا کی مالش چاپی" اس امید پر بھی کرتے ہیں کہ کئی "آنجہانی" بابے کی پنشن ان کے نام ہو جائے گی۔ ہاں البتہ اس عمر میں بعض بابوں کی حالت دیکھ کر یہ دعا دل سے ضرور نکلتی ہے "یا اللہ مجھے کسی کی محتاجی سے بچانا، جسمانی محتاجی اور معذوری ایک عذاب ہے یا اللہ کسی کا محتاج نہ کرنا۔

☆ 75 سال کی عمر میں کامیابی یہ ہے کہ دوستوں کی ایک جمعیت اس کے رابطے میں ہے۔ بات ذرا مشکل ہے کیونکہ 75 سال تک بہت کم بابے اس کی عمر کے باقی رہ جاتے ہیں جو رہ جاتے ہیں ان کی اکثریت نماز اور مصلے تک محدود ہو کر رہ جاتے ہیں کبھی فون پر بات کرو تو اپنی کسی نہ کسی معذوری کا رونا رو دیتے ہیں۔ ''رہ گئے بابے صحت مند تو وہ ہوتے ہیں محدودے چند'' ان سے رابطوں کا تسلسل مزہ تو بہت دیتا ہے جب مل بیٹھتے ہیں تو جوانی کی چند باتیں ہی یاد کر کے اپنی محفل گرم کر لیتے ہیں۔

☆ 80 سال کی عمر میں کامیابی یہ ہے کہ کوئی اگر گھر سے باہر جاتا ہے تو خود ہی واپس بھی آ جاتا ہے۔ تو اول تو

اس عمر میں اکیلے گھر سے باہر جانے کا رِسک کوئی مول نہیں لیتا اور اگر کوئی جا سکتا ہے تو وہ کامیاب انسان اکیلا واپس بھی آ سکتا ہے کیونکہ یہاں پہنچ کر آٹھ سال کی عمر والا پہیہ گھوم کر واپس آیا ہوتا ہے۔

☆ ہمارے ممتحن صاحب نے 85 سال کی عمر والے اس شخص کو کامیاب بنایا ہے جو اپنا پیشاب اور بول براز خود سنبھال سکتا ہو۔ زندگی کا پہیہ گھوم رہا ہے جتنا اوپر جا رہا ہے اتنا ہی نیچے آتا ہے یعنی 85 سال والے بابے کا پہیہ گھوم کر چار سال والے بچے کے برابر آ سکتا ہے۔

اور اللہ معاف کرے یہ وہی وقت ہوتا ہے جب بابا بستر پر سانس تو لے رہا ہوتا ہے مگر اس کے ہمدرد اور لواحقین اس کی عزت سے واپسی کی دعائیں مانگ رہے ہوتے ہیں۔ ''**فاعتبرو یا اولی الابصار**'' اسی کو کہتے ہیں لائف سائیکل مگر ہم تو اس آخری امتحان کا انتظار کر رہے ہیں۔ life is a cycle۔

''جب آئے گی تو دیکھی جائے گی''۔

ہم بڑے ہو گئے

میرا پوتا سید محمد حمزہ ماشاء اللہ پانچ سال کا ہو گیا ہے۔ بڑا ہو کر کیا بنے گا اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ ہاں اس کا بچپن ایک مثالی بچپن ہے، نہ رونا دھونا اور نہ لڑنا جھگڑنا۔ روایتی طور پر سب سے چھوٹا اور لڑکا ہونے کی حیثیت سے لاڈلا اور ضدی ہونا اور ماں باپ کا اُس کی خوشی کو بہنوں کی خوشیوں پر ترجیح دینا اس کا پیدائشی حق تھا۔ مگر اس کی بڑی بہنوں سے نہ کوئی ضد اور نہ جھگڑا۔ بلکہ پیار ہی پیار۔ دوسرے بچوں سے مختلف اس کی عادات اور صفات پر کئی صفحات لکھے جا سکتے ہیں تاہم آج اک اور وجہ سے اس کا ذکر آ گیا۔ یہ ہے گاڑیوں اور کاروں سے اس کا حد درجہ شوق، اور یہ شوق اس کا ہے جنوں کی حد تک۔ گاڑیوں کی اسکی اپنی دنیا ہے۔ گھر میں اس کے لیے ہر رنگ، ہر سائز اور ہر ماڈل کی گاڑی موجود ہے (میری مراد کھلونا گاڑیوں سے ہے) بازار اور شاپنگ مال جا کر وہ خود بھی گاڑی کا ہی تقاضا کرتا ہے اور اس کا والد بھی اس کے لیے نت نئے رنگوں کی گاڑیاں لاتا رہتا ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کے اس شوق نے اُسے روڈ پر چلنے والی گاڑیوں کے نام اور ماڈل سکھا دیئے ہیں۔ وہ اس کم عمری میں بھی سعودی عرب کے بڑے شہروں میں سڑک پر چلتی ہوئی کسی بھی گاڑی کا نام اور ماڈل بتا سکتا ہے۔



محمد حمزہ ثاقب

ثاقب (میرے بیٹے) کے دوست اور Collegues بھی اس کی اس دلچسپی سے واقف ہیں اور اُس سے اس موضوع پر باتیں کر کے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اب گھر میں اس کے پاس (کھلونا) گاڑیوں کی تعداد سینکڑوں تک پہنچ چکی ہے اور اس کے باوجود گھر آنے والے مہمان بچوں کو ایک گاڑی بھی دینے کا روادار نہیں ہوتا۔

اب سنیے اس کے دادا (راقم) کی ایک روداد..................

مجھے یاد ہے میرے بچپن میں اٹک کے شہر فتح جنگ میں ایک میلہ لگتا تھا جس کو ''بابا سائیں حاضر'' اور ''موتیاں والی سرکار'' کا میلہ کہتے تھے میں نے سنا ہے کہ یہ میلہ اب بھی لگتا ہے مگر اُس زمانے میں تو تفریح کا واحد ذریعہ تھا۔ یہ میلہ بھادون (تقریباً اگست کے آخر میں) کے مہینے میں لگتا تھا۔ ایک ہفتہ رہتا تھا اور ہمیں مہنیوں اُس کا انتظار رہتا اور جب ہم اپنے بڑے بھائیوں کے ساتھ ایک دن (یا کبھی کبھی ایک رات کے لیے) میلہ دیکھنے جاتے تو ہماری خوشی کی کوئی انتہا نہ ہوتی۔ میلے کی خاص چیز موسم کا پھل پشاور کی ناشپاتی اور مشہور مٹھائی جلیبی ہوتی تھی جو ہم واپسی پر گھر والوں کے لیے بھی لانا نہ بھولتے۔ تاہم گھر کے لیے یہ چیزیں لانا بڑے بھائیوں کی ذمہ داری ہوتی۔ گھر کے لیے لائی جانے والی ان اشیاء میں ایک اور چیز کا اضافہ بھی ہوتا اور وہ ہوتی ہماری اکلوتی بہن کی گڑیا۔ یہ گڑیا بھی ہمارے بڑے بھائی اپنی چھوٹی بہن کے لیے لاتے او ہم تو اپنی بہن سے چونکہ چھوٹے تھے اس لیے دل چاہتے ہوئے بھی اس ذمہ داری سے بری الزّمہ تھے۔ اس کی چھوٹی سی وجہ ایک اور بھی تھی کہ میلے میں خرچ کے لیے جو رقم ہمیں ملتی تھی وہ ہوتی تھی پورا ایک روپیہ، یہ رقم ہمارے حساب سے اس لیے زیادہ تھی کہ ہمارے ہم عمر کزن کو اس مد میں آٹھ آنے ملتے تھے یعنی نصف روپیہ۔ اب اس ایک روپے میں ہم نے اپنے لیے بھی شاپنگ کرنی ہوتی تھی اور کبھی کبھی جادو کے مختلف کھیل، بندر اور ریچھ کا تماشا اور مداری کے کرتب بھی دیکھنے ہوتے تھے جس پر آنہ دو آنے خرچ کرتے کرتے کافی رقم خرچ ہو جاتی۔ اور اپنی پیاری اور لاڈلی بہن کے لیے گڑیا خریدنیکی خواہش کے باوجود رقم بچا نہ پاتے۔

ذکر ہو رہا تھا اپنے پوتے محمد حمزہ کی گاڑیوں کا، اور ہمیں بابا سائیں حاضر سرکار کا میلہ یاد آ گیا۔ اس میلے پر جاتے وقت بڑوں کی طرف سے یہ نصیحت ضرور کی جاتی کہ ''پھر ٹُر کر میلہ دیکھو'' ان الفاظ میں یہ حکمت پوشیدہ ہوتی ہے کہ میلے میں نظر آنے والی ہر چیز کا خریدنا ضروری نہیں بلکہ بسا اوقات اس کا دیکھ لینا ہی کافی ہوتا

ہے۔ چنانچہ ہم بھی (آجکل کی اصطلاح میں window shoping کے مطابق) بہت ساری چیزوں کو دکانوں میں دیکھ کر ہی اپنے آپ کو مطمئن کر لیتے اور دل میں مچلنے والی خواہشات کو بڑوں کی نصیحت کو سامنے رکھتے ہوئے بڑی آسانی سے دبا لیتے تھے۔ تاہم ایک چیز جس کو پانے کے لیے ہماری خواہش کچھ زیادہ ہی مچل جاتی، وہ منیاری کی دکان میں پڑی ہوئی ٹین سے بنی ہوئی ایک بس ہوتی تھی جس کے لیے نہ چاہتے ہوئے بھی ہم دکان میں گُھس جاتے اور دکاندار سے اس کی قیمت اس امید پوچھ لیتے کہ شاید یہ ہمارے ''ایک روپے'' والے بجٹ کی رینج (Range) میں آجائے مگر۔۔۔۔۔۔۔اے بسا آرزو کہ خاک شد۔

دکاندار ہمیشہ اس کی قیمت پانچ آنے بتا دیتا اور ہم سوچ میں پڑ جاتے کہ پانچ آنے اکٹھے اگر ایک بس پر خرچ کر دیئے تو میلے میں دیکھنے اور خریدنے والی کئی چیزوں از قسم پھل، مٹھائیاں، پکوڑوں، مداری، سرکس اور جادو گھر کے تماشے سے محروم رہ جائیں گے تو مجبوراً ہم یہ خواہش پوری کرنے کا ارادہ اگلے سال پر چھوڑ دیتے۔ اور پھر اگلا سال بھی ہزاروں ایسی نئی خواہشیں لے کر آتا کہ ہر خواہش پہ دم نکلے، اور بس کے حصول کی خواہش کو اس سے اگلے سال پر ٹالنا پڑتا۔ اُس زمانے میں ہم تنخواہ دار اور مزدور طبقے کی ''کم از کم تنخواہ'' کے اصول اور اس میں ہر سال مہنگائی میں اِضافہ کے مطابق تنخواہ میں اضافہ کے اصول سے بے خبر تھے۔ اور نہ ہی اس کے لیے ہڑتال اور احتجاج کے کسی ہتھکنڈے کو جانتے تھے۔ چنانچہ میلے کے خرچے کے لیے جو ''بجٹ ایک روپیہ'' حکومت'' (امی جان سے) پہلے سال منظور ہوا وہی کئی سال تک چلتا رہا۔ مچلتی خواہشات، نامکمل ارمانوں اور منجمد بجٹ کا سلسلہ کئی سال تک چلا اور ہر سال معاشیات کا فارمولہ ''طلب اور رسد'' آڑے آتا رہا۔ پانچ آنے والی ٹین کی بس ہماری خواہش اور ارمان ہی رہا، یہاں تک کہ میں بڑا ہو گیا۔ مناسب لگتا ہے کہ اس واقعہ کے ساتھ کسی شاعر کی ایک چھوٹی سی نظم کا اضافہ کر دُوں۔

مسکراہٹ، تبسم، ہنسی قہقہے
سب کے سب کھو گئے، ہم بڑے ہو گئے

ذمہ داری مسلسل نبھاتے رہے
بوجھ اوروں کا بھی ہم اٹھاتے رہے

اپنا دکھ سوچ کر روئیں تنہائی میں
محفلوں میں مگر مسکراتے رہے
کتنے لوگوں سے ہم مختلف ہو گئے
ہم بڑے ہوگئے، ہم بڑے ہوگئے
اور کتنی مسافت ہے باقی ابھی
زندگی کی حرارت ہے باقی ابھی
وہ جو ہم سے بڑے ہیں سلامت رہیں
ان سبھی کی ضرورت ہے باقی ابھی
جو تھپک کرسلاتے تھے، خود سو گئے
ہم بڑے ہوگئے، ہم بڑے ہوگئے

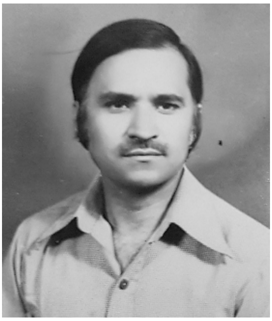
ختم ہونے کو اب زندگانی ہوئی
جانے کب آئی اور کیا جوانی ہوئی
دیکھتے دیکھتے کیاسے کیا ہو گیا
جو حقیقت تھی وہ اب کہانی ہوئی
منزلیں مل گئیں، ہم سفر کھو گئے
ہم بڑے ہوگئے، ہم بڑے ہوگئے

اور کسیِ دوسرے شاعر کا ایک شعر کہ

گھر آ کے بہت روئے ماں باپ اکیلے میں
مٹی کے کھلونے بھی سستے تھے نہ میلے میں

آج اپنے پوتے کی گاڑیوں کو دیکھتا ہوں تو مجھے اطمینان قلب نصیب ہو جاتا ہے۔ اللہ اس کی زندگی کو دنیا اور آخرت دونوں کے لیے وجہ کامرانی بنائے۔

ایک جگری دوست سے قطع تعلق اور پھر تجدید تعلقات


خان فراز خان

خان فراز خان گورنمنٹ ہائی سکول نمبر 2 پشاور شہر میں ٹیچر تھے اور اساتذہ کی سیاست میں دلچسپی لیتے تھے بعد میں آل ٹیچر ایسوسی ایشن میں اپنا ایک گروپ بنایا اور خود اس کے سربراہ بن گئے۔ گورنمنٹ ہائر سیکنڈری سکول نمبر 1 پشاور شہر جہاں میں 1973ء سے 1983ء تک سنئیر انگلش ٹیچر تھا وہاں ان کے بڑے بھائی عمرداز خان (مرحوم) بھی میرے Collegue تھے اور اُن سے خاصی گپ شپ تھی۔ عمرداز کے ذریعے خان فراز سے بھی دوستی ہوگئی اور پھر آل ٹیچرز ایسوسی ایشن میں ہم بھی ان کے ہمراہی ہو گئے۔ اتفاق سے 1982ء میں اساتذہ سرحد (خیبر پختونخواہ) نے اپنے حُقوق ومراعات کے لیے ایک بڑی تحریک شروع کی جو آگے چل کر پورے پاکستان میں پھیل گئی۔ خانفراز صوبہ سرحد میں اساتذہ کے تمام دھڑوں کی ایکشن کمیٹی کے چیرمین منتخب ہو گئے۔ اس تحریکِ ہڑتال میں میرا کردار بہت اہم رہا۔ اور تمام سرد وگرم حالات میں ہم سب دوست ان کے دست و بازو بنے رہے۔ جنرل ضیاء الحق کا مارشل لا تھا اور جنرل فضلِ حق گورنر تھے، تاہم اساتذہ سرحد اور اساتذۂ پاکستان کی جدوجہد اور قربانیاں رنگ لائیں۔

ہڑتال اور جدوجہد میں اساتذہ پاکستان کو کامیابی نصیب ہوئی اور ہماری ایسوسی ایشن دنیائے اساتذہ اور دنیائے محنت (مزدوروں کی تحریک) میں پہچانی جانے لگی۔ باہر سے چند دیگر تنظیموں کے علاوہ انٹرنیشنل فیڈریشن آف فری ٹیچر یونین IFFTU کے نمائندہ برائے ایشیاء گرنام سنگھ اور کچھ اور لوگ پاکستان آئے اور یہاں پر تمام صوبوں کے نمائندوں کی ایک متحدہ اور نمائندہ تنظیم پاکستان ٹیچرز آرگنائزیشن کونسل (PTOC) بنا کر اُسے آرگنائز کرنا شروع کر دیا۔ اسی طرح ورلڈ لیول کی ایک اور تنظیم ورلڈ کنفڈریشن آف ٹیچنگ پروفیشنز آرگنائزیشن (WCOTP) کے نام سے ایک دوسری تنظیم Mr.Mathews مسٹر میتھیو کے ذریعے وجود میں آئی اور اس نے بھی PTOC کو اپنے ساتھ Affiliate کر لیا۔ یہ تنظیمیں پاکستان کے مختلف شہروں میں سیمنار کرواتیں اور اساتذہ کو مل بیٹھنے اور مختلف صوبوں کے اساتذہ کے مسائل سمجھنے میں مدد ملتی۔ اس کے ساتھ ہی یہ تنظیمیں اساتذہ نمائندوں کو اپنے خرچ پر بیرون ملک دوروں پر بھجواتیں۔

1990ء کی دہائی سے پہلے IFFTU بہت متحرک ہو چکی تھی اور پاکستان سے PTOC اس کی واحد Affiliate تھی تاہم 1989ء میں مجھے جب IFFTU نے ایک کورس کے لیے آسٹریلیا کے شہر ALbury/ Wodonga بھجوایا تو وہاں پر میری ملاقات WCOTP کے نمائندے Mr.Mathews سے ہوئی یہ آدمی بنیادی طور پر انڈین تھا۔ ملائشیا کا شہری (Citizen) اور تھائی لینڈ میں شادی کر کے وہیں کا ہو گیا۔ اُس نے آسٹریلیا میں کورس کے دوران مجھ سے ملاقات کی اور WCOTP کا تعارف کروایا اور اپنی تنظیم کے ساتھ PTOC کا الحاق کرنے کی پیشکش کی۔ جسے پاکستان واپس آ کر خانفراز خان اور دیگر دوستوں کے مشورے سے ہم نے قبول کر لیا۔ اور کچھ عرصے بعد پاکستان ٹیچرز آرگنائزیشن کونسل کا الحاق WCOTP سے بھی ہو گیا۔ چنانچہ اب PTOC دو بین الاقوامی تنظیموں کے ساتھ ملحق ہو گئی اور یہیں سے PTOC کے اندر گروپ بندی کا آغاز ہوا۔ IFFTU کے نمائندے گرنام سنگھ (ملائشیا کا شہری) PTOC کے جنرل سیکرٹری اقبال شجاع (کراچی) کی سرپرستی کرنے لگے اور WCOTP کے نمائندہ Mathews مسٹر میتھیوز PTOC کے صدر خانفراز کی حمایت کرنے لگا۔ اتفاق ایسا ہوا کہ سوویٹ یونین کے ٹوٹنے کے بعد جب دنیا Unipolar ہونے لگی تو عالمی سطح پر اساتذہ کی تمام تنظیموں کو ایجوکیشن انٹرنیشنل (EI) کے نام سے یکجا کر دیا گیا۔ اور اس میں سابقہ نمائندوں کو بحال رکھا گیا اور وہ کسی نہ کسی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ ادھر PTOC میں جو گروپ بندی ہو چکی تھی اس میں تیزی آ گئی اور دونوں گروپوں میں رسہ کشی بڑھنے لگی چنانچہ ان کے درمیان مصالحت کرانے کے لیے بین الاقوامی ٹیچرز تنظیموں EI کے نمائندے پاکستان بھی آئے اور اسلام آباد میں ہماری مشترکہ میٹنگ بلوائیں، الیکشن بھی کروایا مگر یہ سب کچھ لاحاصل رہا اور اختلافات کی نوعیت کم ہونے کی بجائے بڑھتی گئی۔

آل ٹیچرز ایسوسی ایشن صوبہ سرحد (خیبر پختونخوہ) اور پاکستان ٹیچرز آرگنائزیشن کونسل کی ترقی اور افزائش کئی سالوں تک چلتی رہی اور میں PTOC میں خانفراز کے ساتھ بحیثیت نمبر 2 اور قریبی دوست کے کام کرتا رہا۔ ہمارے تعلقات کا دائرہ وسیع ہوتا رہا اور قربت بڑھتی رہی یہاں تک کہ یہ تعلقات گھریلو اور ذاتی تعلقات تک وسیع ہونے لگے۔ ایک دوسرے کے گھروں میں آنا جانا اور دونوں کی ازواج اور بچوں کے بھی آپس میں تعلقات قائم ہو گئے۔ اس عرصے میں پاکستان بھر کے شہروں میں سیمینار اور میٹنگز کے سلسلے میں اکٹھے جاتے اور کبھی کبھی بچوں کو بھی ساتھ لے جاتے۔

سوویٹ روس کے زوال کے بعد بڑی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ اساتذہ کی چار بڑی بین الاقوامی تنظمیں WCOTP,IFFTU اور دو اور بڑی تنظیمیں جو روس کے زیر اثر کام کر رہی تھیں آپس میں ضم ہو گئیں اور EI (ایجوکیشن انٹرنیشنل) کے نام سے ایک بڑی تنظیم وجود میں آ گئی جسے UN میں انٹرنیشنل لیبر آرگنائزیشن ILO نے تسلیم کرلیا۔اس دوران گرنام سنگھ نمائندہ IFFTU منظر سے غائب ہو گئے۔اور مسٹر میتھیوز، ایجوکیشن انٹرنیشنل کے ایشیاء کے نمائندہ مقرر ہو گئے۔ خان فراز اور میں نے PTOC کے نمائندے کے طور پر کئی ممالک مثلاً تھائی لینڈ، سنگاپور، ہانگ کانگ، آسٹریلیا، انڈیا اور فرانس وغیرہ کے لیے دورے کیے اکھٹے سفر کیے، رازو نیاز Share کئے۔مگر پھر اچانک انہی معاملات میں باہمی بدگمانی اور شکوک وشبہات پیدا ہونے لگے۔گرنام سنگھ اور میتھیوز کی آپس میں رسہ کشی اور گروپ بندی ہمارے تعلقات پر بھی اثر انداز ہو نے لگی اور ہماری دُوریاں بڑھنےلگیں۔فاصلوں کے بڑھانے میں ہمارے کچھ مقامی دوستوں کا بھی کردار تھا۔ یہاں پر بات قابل ذکر ہے کہ ہماری آپس میں لڑائی جھگڑا تو دور کی بات، کبھی تلخ کلامی کی نوبت بھی نہیں آئی مگر معاملات یہاں تک پہنچ گئے کہ ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے ہماری بات چیت اور دعا سلام بھی ختم ہو گئی اور پھر کئی سالوں تک ایک شہر میں ہوتے ہوئے ایک دوسرے سے بے خبر رہے۔کبھی کبھار مشترکہ دوستوں سے میں خانفراز کے بارے میں پوچھ لیتا۔اس دوران خانفراز سرکاری ملازمت (تدریس) سے ریٹائر ہو گئے مگر ایسوسی ایشن کواس حدتک چلاتے رہے کہ کبھی کبھار بیرون ملک دورے کر لیتے۔

جون 2002 میں میری اہلیہ کے انتقال کا سانحہ ہوا مگر شاید اس موقع پر بھی ہم نہ مل سکے۔حالانکہ ان کی اہلیہ امتیاز بیگم جو میری اہلیہ امام بی بی (مرحومہ) کی گہری سہیلی تھیں، تعزیت کے لیے ہمارے گھر نہ آسکیں۔اور پھر نہ صرف ہم بلکہ ہمارے بچے بھی ایک دوسرے کو بھول گئے۔ میں خانفراز سے الگ ہو کر بھی PTOC اور بعد ازاں TCOP (ٹیچرز کنسورشیم آف پاکستان TCOP) میں کئی سال تک متحرک رہا۔ پہلے کئی سال تک چیف آرگنائز اور پھر مرکزی صدر کے عہدے پر رہا۔اب اقبال شجاع صاحب اور میں اکٹھے کام کر رہے تھے۔اقبال شجاع بھی اب علیل ہیں اور TCOP بھی عملاً معطل ہے۔خود خانفراز بھی عمر رسیدہ ہو نے کی وجہ سے ان تمام سرگرمیوں سے سبکدوش ہو کر اپنی سرگرمیاں صرف گھر اور خاندان تک محدود کر چکے ہیں۔ مجھے اس دوران کئی مرتبہ خیال آیا کہ کیوں نہ خانفراز سے مل لیا جائے۔نہ جانے کس گھڑی ہم دونوں میں کسی ایک کی زندگی کی ''شام'' ہو جائے۔باقی اعمال کا حساب تو الگ ہوگا مگر اس کا جواب کیسے دیں گے کہ ایک

عزیز دوست کو آخری وقت میں بھی ناراض چھوڑا۔

26 ستمبر 2015:

پھر اچانک ایک دن میں نے اپنی گاڑی کا رُخ گلبرگ کی طرف موڑا اور ان کے گھر کے باہر گاڑی کھڑی کر کے ایک واقف کار سبزی فروش سے خانفراز کا پتہ پوچھا۔ تو اُس نے اشارہ کر کے بتایا کہ اس گلی میں ہیں سامنے ان کا گھر ہے۔ میں نے کہا ہے مجھے گلی اور گھر کا پتہ معلوم ہے خود ان کے بارے میں بتاؤ۔۔ یہاں ہیں؟ اُس نے بتایا کہ وہ ٹھیک ہیں اور گھر پر ہوں گے۔ میں نے دروازے پر جا کر گھنٹی بجائی تو ایک سات آٹھ سال کا بچہ نکلا، پوچھا کس کے بیٹے ہو تو وہ بولا ''جہاں فراز'' میں نے اس کی شکل سے اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ جہاں فراز (مُون) کی بچپن کی تصویر ہے میں نے ازراہ تفنن پوچھا خانفراز کو جانتے ہو تو اس نے کہا کہ وہ میرے بابا ہیں اور گھر پر ہیں۔ میں نے اُسے کہا کہ اندر جا کر انہیں بتاؤ کہ آپ کے ایک پرانے دوست آئے ہیں اور پھر تھوڑی دیر بعد خانفراز نظر کی عینک لگائے میرے سامنے کھڑے تھے مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہے تھے یا نظر کا کوئی مسئلہ تھا۔ مجھے دیکھا تو دروازے سے باہر آ گئے۔ تپاک سے گلے ملے، اندر جا کر ڈرائنگ روم میں بٹھایا وہیں سے بھابھی کو آواز دی کہ ''مشتاق صاحب آئے ہیں'' چنانچہ وہ بھی آ گئیں۔ دونوں میاں بیوی حیرانی اور مسرت کے ملے جلے جذبات سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ اپنے تمام بچوں کے بارے میں ایک ایک کر کے بتایا اور مجھ سے میرے بیٹوں کا پوچھا۔ دونوں طرف سے اطمینان کا اظہار ہوا کہ اولادیں ماشاءاللہ کامیاب ہیں۔ خانفراز صاحب کے بڑے بیٹے انجینئر اور چھوٹے تینوں ڈاکٹر ہیں۔ بقول ان کے اپنے اپنے حالوں میں مست اور ان سے رابطے اور تعلق میں ہیں۔ اور یوں ہمارا قریباً 26,25 سال کا ٹوٹا رشتہ دوبارہ بحال ہو گیا۔ میرے ضمیر نے مجھے شاباش دی۔ اس موقع پر ناصؔر کاظمی کے چند اشعار یاد آ گئے

زندگی بھر وفا ہمی سے ہوئی　　سچ ہے یارو خطا ہمی سے ہوئی
ستم ناروا تجھی سے ہوا　　تیرے حق میں دعا ہمی سے ہوئی
سعیِ تجدیدِ دوستی ناصؔر　　آج کیا بارہا ہمی سے ہوئی

(26 ستمبر 2015ء کی اس ملاقات کے بعد فون پر اور کبھی کبھی بالمشافہ ملاقاتیں جاری رہیں مگر 30 دسمبر 2018ء کو اچانک فون پر اطلاع آئی کہ خانفراز اس دارِفانی سے ہمیشہ کے لیے کُوچ کر گئے۔)

عجیب وغریب واقعات

زندگی میں سیکڑوں مرتبہ ایسے واقعات سے پالا پڑا کہ ان کے ہونے کا خود کو بھی یقین نہیں آتا۔ اور دوسروں کو بتاتے ہوئے بھی خوف آتا ہے کہ سننے والا میری عقل پر شک نہ کرنے لگے۔ مافوق الفطرت عناصر یعنی جن، بھوت، پریوں اور بلاؤں کا ذکر اکثر اپنے ہمجولیوں سے سنا اور کتابوں میں بھی پڑھتے تھے۔ بچپن میں ان واقعات کو سن کر ان پر یقین بھی کر لیتے۔ کبھی کبھی خوف اور ڈر کی کیفیت بھی پیدا ہوتی مگر بعد ازاں حصولِ تعلیم کے بعد اور گھر کا ماحول پڑھا لکھا ہونے کی وجہ سے ضعیف الاعتقادی کبھی غالب نہ آئی۔

مندرجہ ذیل دو واقعات کوئی جنوں، بھوتوں یا جادو کے واقعات نہیں ہیں۔ سچ مچ کی زندگی میں پیش آئے ہیں اور آج تک یاد ہیں اور بغیر کسی مبالغہ کے آپ کے سامنے بیان کرتا ہوں۔

جھاڑی کا ہنسنا:

بچپن میں پانچویں جماعت کے بعد چھٹی جماعت میں گاؤں (گکھڑ) سے پانچ کلومیٹر دور گورنمنٹ ہائی سکول باہتر میں داخل ہوا۔ گکھڑ سے باہتر تک ایک کچی سڑک ہمارا راستہ تھا لیکن اس سڑک تک آنے سے پہلے کھتیوں میں سے کچھ پگڈنڈیوں سے گزر کر جانا پڑتا۔ ایک دن صبح صبح سکول جاتے ہوئے اسی پگڈنڈی سے گزر رہا ہوا۔ چھوٹے جنگلی بیروں کی ایک چھوٹی سے جھاڑی (جس کو ہم مقامی زبان میں جھاڑی ہی کہتے ہیں) کے قریب سے گزرتے ہوئے میرے کپڑے اس جھاڑی سے چھو گئے اور اس کی شاخیں ہلنے لگیں۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو مجھے یہ جھاڑی مسکراتی ہوئی نظر آئی۔ میں تھوڑی دیر رک کر اسے غور سے دیکھتا رہا مگر یہ کیفیت ختم نہ ہوئی۔ چند قدم آگے چل کر دوبارہ اسے مڑ کر دیکھا تو یہ جھاڑی مزید واضح طور پر ہنستی ہوئی محسوس ہوئی۔ جھاڑی کی یہ مسکراہٹ اچھی بھی لگ رہی تھی اور حیرت واستعجاب کی کیفیت بھی طاری تھی۔ اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا مگر سب کچھ میرے سامنے تھا۔ تھوڑی دیر اسی جگہ رُک کر آگے پیچھے دیکھتا رہا۔ اپنا کوئی ہم جماعت یا ہم مکتب بھی نظر نہیں آیا تو دوبارہ جانب سکول چل پڑا۔ آج اس واقع کو گزرے ساٹھ سال سے زائد کا عرصہ ہو گیا ہے مگر یہ واقع اسی طرح میرے ذہن پر نقش ہے۔ یہ کیفیت کیوں اور کیسے پیدا ہوئی شاید کسی

عالم،ادیب،شاعر،صوفی، ماہرِنفسیات دانشور یا کسی خدارسیدہ بابے کے پاس اس کا جواب موجود ہو۔ ورنہ میں خود آج تک اس واقع کو سوچ کر حیرانی کی کیفیت میں ڈوب جاتا ہوں۔

قائداعظم محمد علی جناح کی تصویر اور دیگر واقعات:

یہ بھی غالباً اُس وقت کی بات ہے جب میں ہائی سکول میں پڑھتا تھا۔ اپنے گھر سے نکل کر دائیں ہاتھ نیچے جانے والی گلی جونہی بائیں جانب مڑتی ہے تو وہاں بھٹیاروں کے کچھ گھر تھے۔ اُس وقت ان کے گھروں میں مکئی اور جوار وغیرہ کے دانے بھوننے کی بھٹیاں اور تنور وغیرہ تھے۔ ایک دن گلی سے گزرتے ہوئے مجھے اخبار کے کچھ جلے ہوئے کاغذ نظر آئے۔ خلاف عادت اٹھا کر دیکھا تو اس میں کچھ تحریر اور قائداعظم محمد علی جناح کی ایک تصویر نظر آئی۔ ذرا غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ تصویر کے تین اطراف سے کاغذ مکمل طور پر جلا ہوا تھا مگر درمیان میں قائداعظم کی تصویر صحیح و سالم تھی۔

کافی مدت بعد جب ایک مرتبہ قائداعظم کی وفات اور ان کے جنازے کے واقعات پڑھ رہا تھا جس میں علامہ شبیر احمد عثمانی کے حوالے سے بتایا گیا کہ انہوں نے خواب میں نبی کریم ﷺ کو دیکھا جنہوں نے آپ سے فرمایا کہ محمد علی جناح میرا مجاہد ہے اور حکم دیا کہ جا کر ان کی نماز جنازہ پڑھاؤ۔ اسی طرح اپنے والد مرحوم پیر سید محمد علی شاہ کی زندگی کے واقعات قلمبند کرتے ہوئے۔ میرے برادر زادہ ڈاکٹر سید اسد حسین شاہ نے ایک واقعہ اس طرح بیان کیا ہے۔

ہمارے والد بزرگوار اور قائداعظم:

اپنے دادا مرحوم (میرے والد بزرگوار) کے بارے میں میری کتاب ''راہ نورد ِشوق'' میں عزیزم ڈاکٹر اسد حسین شاہ رقمطراز ہیں۔ ''ایک دفعہ میں نے اُن سے پوچھا کہ قائداعظم کے بارے میں ان کا کیا خیال ہے؟ اب سوال میں کسی عام آدمی یا کسی ٹیچر سے پوچھتا تو وہی جواب ہوتا جو میری درسی کتب میں لکھا ہوا تھا۔ سو میرے سوال کا مقصد کوئی اور تھا۔ یہ ایک عالم باعمل سے ایسی شخصیت کے بارے میں سوال تھا جو ایک باکمال سیاسی راہنما تو تھے لیکن روایتی شخصیت ہرگز نہ تھے اور جن کے بارے میں مذہبی حلقوں میں ایک خاص قسم کی کراہت یا ناپسندیدگی بھی پائی جاتی تھی۔ دادا جی نے جو جواب دیا وہ میرے لیے بالکل غیر متوقع تھا۔

فرمانے لگے بیٹا میں جناح صاحب کے بارے میں بس اتنا ہی جانتا تھا کہ کوئی انگریز ٹائپ کا سیاسی لیڈر رہے اور جس نے ایک نئے ملک کی بنیا درکھ دی لیکن ان کے لیے میرے دل میں کوئی نسبت یا لگاؤ ہرگز نہیں تھا لیکن پھر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ 1951ء مجھے سفرِ حج پر جانے کی سعادت حاصل ہوگئی۔ میں نے بذریعہ بحری جہاز جانا تھا اس لیے پہلی منزل کراچی شہر تھا۔ جب کراچی پہنچا تو جی چاہا کہ اس شہر کو گھوم پھر کے دیکھ لیا جائے۔ سن رکھا تھا کہ جناح صاحب کا انتقال ہو چکا ہے۔ اور ان کی تدفین اسی شہر میں ہوئی ہے سو میں نے سوچا کہ نئے ملک کے بانی کی قبر بھی دیکھ لی جائے۔ سو میں ان کی قبر پر چلا گیا۔ حسب عادت فاتحہ پڑھی اور واپس چل پڑا لیکن اچانک یوں محسوس ہوا جیسے میرے قدموں نے چلنے سے انکار کر دیا ہو یا زمین نے میرے پاؤں پکڑ لیے ہوں اور میرے اندر سے جیسے کوئی کہہ رہا ہو کہ ٹھہرو تم ویسے نہیں جاسکتے۔ یہ کوئی عام آدمی کی قبر نہیں ہے کہ فاتحہ پڑھی اور چل دیئے۔ میں نے قبر کے آس پاس دیکھا تو ایک جگہ قرآن کے سپارے رکھے ہوئے تھے۔ میں واپس قبر کے پاس آیا سپارہ اٹھایا اور تلاوت شروع کر دی۔ کئی سپارے تلاوت کرنے کے بعد مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے اب مجھے واپسی کی اجازت مل گئی ہے۔ تو اس دن مجھے اس بات پہ شرح صدر ہو گیا ہے کہ جناح خدا کے برگزیدہ بندوں میں سے ہے۔ اور اب میرا ان کے بارے میں یہی خیال ہے''۔ یہ واقعہ میں نے پہلے بھی سن رکھا تھا لہٰذا قائداعظم کی اس تصویر کے واقعہ کے بعد میں اسے ایک روحانی تجربہ سمجھتا ہوں۔ (راقم)

پیپل اور شیشم کے درخت (یک جان دو قالب):

پشاور شہر میں نقل مکانی اور مستقل رہائش کے بعد میں پشاور کینٹ کی حدود سے ملحقہ بستی باڑہ گیٹ میں رہنے لگا تو اس وقت سے لے کر آج تک اپنی ڈیوٹی پر جانے کیلیے، بازار سے سودا سلف لانیکے لئے یا صدر اور یونیورسٹی جانے کیلیئے ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے پشاور کا مال روڈ اور اسی راستے سے میرا صبح شام گزر ہوتا ہے۔ یہاں بھی ایک ایسا عجوبہ میرے مشاہدے میں آیا جو آج کل کی ٹیکنالوجی کے دور میں تو ممکن ہے مگر عام قدرتی حالات میں بہت کم دیکھنے میں آیا ہے۔

قارئین کی رہنمائی کیلیئے جگہ بھی بتا دیتا ہوں............................اگر آپ باڑہ روڈ یا حیات آباد رنگ روڈ کی طرف سے پشاور صدر کی مال روڈ کی طرف آئیں تو ریلوے کراسنگ کے قریب آرمی

چیک پوسٹ کراس کرنے کے بعد سیدھے رخ جاتے ہوئے چند قدم کے فاصلے پر مال روڈ کے بالکل آغاز میں دائیں ہاتھ پاکستان ایئر فورس کی مشہور رہائشی کالونی فالکن کمپلیکس 68 دی مال کا داخلی دروازہ نظر آئے گا۔ اس کے بالکل مدمقابل یعنی آپ کے بائیں ہاتھ پاکستان ایئر پورس کا ایک بڑا دفتر نادرن ایئر کمانڈ (Northern Air Command) کا بڑا بورڈ اور ساتھ داخلی دروازہ نظر آئے گا اس دفتر یا کمپلیکس کے (عموماً بند) گیٹ کی طرف رخ کر کے کھڑے ہوں تو دائیں ہاتھ شیشم کا ایک بڑا درخت ملے گا۔ یہ درخت مال روڈ کے دوسرے درختوں کی طرح سو دو سو سال پرانا تو نہیں لگتا مگر گزشتہ پچاس سالوں سے اس کو میں نے اسی طرح ایک تناور درخت کی شکل میں دیکھا ہے۔

شیشم کے درخت کی تقریباً 20 فٹ اونچائی پر دو بڑی شاخوں کے درمیان آپ کو پیپل کا ایک درخت نظر آئے گا جس کی جڑیں تو نظر نہیں آتیں مگر درخت ضرور موجود ہے۔ اب سوچنے کا مقام ہے کہ زمین سے سے تقریبا 20 فٹ اونچائی پر شیشم کے درخت پر پیپل کے درخت کو خوراک کہاں سے ملتی ہے؟ اس کی جڑیں کہاں ہیں اور اگر ہیں تو ہمیں نظر کیوں نہیں آتیں؟ انسانوں کو دوسری نسل کے انسانوں کے بچوں کو پالتے ہوئے دیکھا ہے۔ جنگلی اور دیگر جانوروں کو بھی دوسری نسل کے جانوروں کو دودھ پلاتے ہوئے اور ان کی حفاظت کرتے ہوئے دیکھا ہے مگر ایک درخت کو دوسری نسل کے درخت کو اپنے اندر پالتے ہوئے دیکھ کر اب بھی مجھے حیرت ہوتی ہے اور میری نظر میں یہ بھی ایک عجوبہ ہے (گزشتہ چند سالوں سے پیپل کا یہ سرسبز درخت سوکھنے لگا ہے جبکہ شیشم کا درخت بدستور ہرا بھرا ہے۔ قدرت کے اس کا عجوبے کی تصویر اس لیے نہیں بنا سکتا ہوں کہ عموماً افواجِ پاکستان کے اہم دفاتر اور حساس علاقوں کی تصاویر لینے پر پابندی ہوتی ہے اور چوری چھپے تصویر بنا کر میں کسی الجھن میں نہیں پڑنا چاہتا۔ تاہم تجسس کے کسی بھی لمحے آپ خود وہاں جا کر اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر سکتے ہیں؟)۔

قائداعظم محمد علی جناح کی زندگی کے چند روحانی پہلو

The reason why Quaid-i-Azam said, "There is no power on the earth that can undo Pakistan "

کسی نے بتایا تھا قائداعظم نے بتایا تھا ایسی بات نہیں ہے۔ جیسی آپ پوچھ رہے ہیں۔ میں آپ کو بتاؤں گا لیکن ایک شرط کہ آپ کسی کو نہ بتائیں جب تک میں زندہ ہوں۔ اس پر شبیر احمد عثمانی نے کہا ٹھیک ہے۔ پھر قائداعظم نے بتایا میں لندن میں تھا۔ ایک رات کو میرا پلنگ ہلنے لگا میں نے جاگ کر ادھر ادھر دیکھا تو کوئی نہیں تھا۔ میں سو گیا اور دوبارہ پلنگ ہلنے لگا اتنے زور سے کہ میں سمجھا زلزلہ آ گیا ہے۔ میں جاگ گیا اٹھ کر گھر سے باہر آ گیا دیکھا تو کوئی نہ تھا۔ میں سمجھا کہ کوئی نہیں ہے۔ کوئی آواز نہیں ہے۔ میں تیسری بار سو گیا تیسری بار پلنگ ہلنے لگا میں نے جا کر دیکھا تو ایک شخصیت کھڑی تھی میرے کمرے میں۔ میں نے سوچا کہاں سے آ گئی تھی۔ اور کون شخصیت ہے۔ میں نے پوچھا انگریزی میں "Who are you" جواب بھی انگریزی میں اول درجہ کی آکسفورڈ انگریزی میں ملا۔

I am your prophet "Muhammad" (peace be upon him)

قائداعظم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے پورے جسم کے۔

What can I do for you lord? (حضورؐ میں آپ کے لئے کیا کر سکتا ہوں)

پھر جناب حضورؐ پاک نے بتایا انگریزی زبان میں،

You are urgently needed by the Muslims of sub continent
I order you to go there and lead the freedom struggle.
"You will succeed in your mission"
"Don't worry, I will be with you InshaAllah"

اس لئے قائداعظم کا کہنا ہے کہ پاکستان کو کوئی ختم نہیں کر سکتا۔ خود حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم ہماری مدد کر رہے ہیں ہمارے ساتھ ہیں۔

موت وحیات کا فلسفہ۔۔۔اپنی زندگی سے ایک سبق

31 دسمبر 1970ء اس سال کا آخری دن تھا اور اُسی دن گورنمنٹ مڈل سکول بھانہ ماڑی پشاور میں بحیثیت ایس، وی ٹیچر میری تقرری ہوگئی۔ میری اپنی کوالیفیکیشن اس وقت ایم۔اے ایجوکیشن تھی مگر میں نے زیادہ عرصہ بیروزگار رہنے کی بجائے یہ پوسٹ اس لیے قبول کرلی کہ 1969ء کے مارشل لاء کی وجہ سے نئی بھرتیوں پر پابندی عائد تھی۔ خیر مڈل سکول بھانہ ماڑی جائن کرنے کے بعد مجھے سکول میں کہا گیا کہ آپ سب سے پہلے سروس بک بنوائیں۔ میں گورنمنٹ پریس خود جاکر وہاں سے سروس بک لے آیا۔ایک دن اُس وقت کے اے۔ڈی۔آئی (اسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز) ہمارے سکول آئے اور مجھے کہا کہ اگر آپ نے سروس بک جلدی تیار کروانی ہے تو میرے گھر آجائیں آرام سے بیٹھ کر بنائیں گے۔

اے۔ڈی۔آئی صاحب۔۔۔۔۔۔بہت اچھے آدمی تھے۔ میرا کسی سپیریر افسر سے پہلا واسطہ تھا اگلے اتوار کو میں ان کے گھر گیا اور انہوں نے چائے سے میری خاطر مدارت کی ہیں ان کی غیر متوقع آوٗ بھگت سے بہت متاثر ہوا وہ یقیناً خوش اخلاقی سے پیش آئے۔ اور جلد ہی سروس بک کے ابتدائی صفحات لکھنے بیٹھ گئے۔ وہ سروس بک میں چند باتیں میرا ریکارڈ دیکھ کر اور چند معلومات مجھ سے زبانی پوچھ کر اندراج کر رہے تھے۔ جب سب اندراج پورے کر لیے تو مہریں وغیرلگا کر مجھے سروس بک واپس پکڑا دی۔ سروس بک ہاتھ میں لے کر میں اپنی معلومات کے لیے ابتدائی صفحات کے کچھ کالم پڑھنے لگا۔ نام، ولدیت، تعلیم، پیشہ ورانہ قابلیت، تاریخ پیدائش، تاریخ ریٹامنٹ وغیرہ۔ میری تاریخ پیدائش سکول کے ریکارڈ کے مطابق یکم مارچ 1947ء لکھی ہوئی تھی۔ میں نے جب تاریخ ریٹائرمنٹ پر نظر ڈالی تو 28 فروری 2007ء لکھا پایا۔ اتنی دور کی تاریخ۔۔۔۔ میں سوچ میں پڑ گیا۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ 2007ء بھی میری زندگی میں آسکتا ہے۔ کیا میں 2007ء تک یعنی 37 برس مزید بھی زندہ رہ سکتا ہوں۔

سوچ کے اس تانے بانے میں مَیں ان سے رخصت لے کر نکل آیا۔ پھر ملازمتی زندگی کا ایک طویل سفر شروع ہوگیا۔ نئی پوسٹوں پر ترقیاں، تنخواہوں میں اضافہ، سکولوں میں طویل اور مسلسل تدریسی عمل، اساتذہ حقوق کے لیے جدوجہد (ٹیچرز ایسوسی ایشن)، بین الاقوامی اساتذہ تنظیموں سے رابطے، غیرملکی دورے،

ہڑتالیں، تنازعے، مزید پرائیویٹ تعلیم، شادی، بچے، حج بیت اللہ، بچوں کی تعلیم، کرایے کے گھروں میں رہائش، رہائش کے لیے گھروں کی تعمیر، بچوں کی ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم، والدین کی یکے بعد دیگرے وفات، بھائیوں کی شادیاں، ان کی سرپرستی، ان کے ساتھ قطع تعلق اور تجدید تعلقات، ملازمت میں تبادلے، نئی دوستیاں، گروپ، رسہ کشیاں، اندرون ملک، اسلام آباد، لاہور، کراچی، کوئٹہ، مظفر آباد، اور ایبٹ آباد میں سمیناروں میں شرکت بیرونی ممالک جیسے تھائی لینڈ، ہانگ کانگ، سنگاپور، انڈیا اور فرانس جیسے ممالک کے دورے، آسٹریلیا میں تربیتی کورس، اپنی شریک حیات کی اچانک رحلت، اپنے بچوں کا طویل تعلیمی عمل، اُنکی تعلیم کی تکمیل، اُنکے روزگار اور حصولِ ملازمت اُن کی شادیاں بچے غرض کیسے کیسے واقعات پیش آتے رہے اور گزرتے رہے اور پھر اسی مستعار زندگی کے دوران بیسویں صدی عیسوی کا اختتام ہوا اور اکیسویں صدی کا آغاز یعنی 2001ء آ گیا۔ اور ایک نئے ملینیم (ہزاریئے) کا آغاز بھی ہوا۔

یہاں پہنچ کر کبھی کبھی ذہن میں خیال آتا کہ اب تو میری ریٹائرمنٹ بھی قریب آ رہی ہے اور پھر ایک دن خیال آ گیا کہ 2007ء تو میری ریٹائرمنٹ کا سال ہے۔ کچھ ہی عرصہ گزرا کہ 2007ء بھی آ گیا سکول کے رفقائے کار اور چند دوسرے دوست میری ریٹائرمنٹ پر شاندار پروگرام ترتیب دینے کے لیے منصوبے بنانے لگ گئے۔ ایک کے بعد دوسری الوداعی دعوت کسی تقریب میں ڈائرکٹر اور کسی تقریب میں وزیر مہمان خصوصی، کسی دن مرد پرنسپلز اور کسی روز خواتین پرنسپلز کی طرف سے الوداعی دعوتیں، مختلف کلاسوں اور ان انچارج ٹیچرز کی طرف سے انفرادی تحفے اور شیلڈیں۔

ملازمت کے آخر بارہ سال ایک ہی سکول گورنمنٹ سینٹیل ماڈل ہائی سکول پشاور کینٹ میں پشاور کے سکولوں میں ملازمت، پرنسپلز کا ریکارڈ ٹینیور (Tenure)، ثابت ہوا کہ سب چیزوں کا اختتام ہے، زندگی جتنی بھی طویل ہو جائے۔ موت کا ایک دن معین ہے۔

اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا(۱) وَ اَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا(۲) وَ قَالَ الْاِنْسَانُ مَا لَهَا(۳)

ترجمہ: جب زمین بھونچال سے ہلا دی جائے گی۔ اور زمین اپنے (اندر) کے بوجھ نکال ڈالے۔ اور انسان کہے گا کہ اس کو کیا ہو گیا ہے؟

کچھ لوگ میری ریٹائرمنٹ کے بعد خالی ہونے والی نشت کو پُر کرنے کے لیے کوششوں میں لگ گئے۔ اور پھر کچھ دن گزرے تھے کہ 28 فروری 2007ء بھی آ گیا اور میں 37 سالہ ملازمت پورا کر کے ریٹائر ہو کر گھر آ گیا۔ یکم مارچ 2007ء کو میں سکول نہیں گیا اور اس دن میں سوچ رہا تھا کہ 37 سال کا یہ عرصہ کتنا مختصر تھا، ایسے لگ رہا تھا کہ جیسے کل ہی Appointment آرڈر ہوئے ہیں اور میں ADI صاحب سے سروس بک بنوا کر گھر لایا ہوں۔

زندگی اور موت کے فلسفے کی تھوڑی سی سمجھ آئی۔ بزرگ کہتے ہیں ''کہ جس دن موت کا فرشتہ سرہانے کھڑا ہوگا تو انسان کہے گا کہ مجھے تو پتہ ہی نہیں چلا میرا آخری دن اتنا جلدی آ گیا۔ کاش مجھے کچھ نیک اعمال کرنے اور توبہ کرنے کا کچھ وقت مل جاتا''۔ جس طرح زندگی کے ساتھ موت حقیقت ہے اسی طرح ملازمت کے ساتھ ریٹائرمنٹ بھی حقیقت ہے۔ یہی دونوں میں مماثلت ہے کہ طویل سے طویل تر ملازمت کے بعد بھی آخر ایک دن ریٹائرمنٹ کا دن ضرور آتا ہے اور یہی اس قصے میں سبق ہے کہ وقت کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ یہی سبق قیامت کے روز پر بھی لاگو ہوگا۔

وَاِذَا مَرِضۡتُ فَهُوَ يَشۡفِين

1۔ نمونیہ

زندگی اور اس کے ساتھ لازم وملزوم موت کا فلسفہ ایک ایسی گُتھی ہے جس کو آج تک بڑے سے بڑے فلسفی بھی نہ سلجھا سکے۔ زندگی کے ساتھ ایک اور حقیقت بھی ہے جسے بیماری یا مرض کہتے ہیں۔ بیماری زندگی کا ایک عنصر تو ہے اور موت کے لئے ایک وجہ اور بہانہ تو بنتی ہے مگر موت کے ساتھ بیماری کوئی لازمی عنصر نہیں۔ حادثات بھی موت کا سبب بن سکتے ہیں اور بعض اوقات بیٹھے بٹھائے اور سوتے ہوئے بھی موت آسکتی ہے حالانکہ اس کا بھی سبب ہے اور وہ ہے دل کا اچانک ساتھ چھوڑ جانا۔ اور یہاں تاریخی طور پر آج تک زندگی کا سب سے بڑا سبب جنگیں رہی ہیں۔ جس میں خود انسان ایک دوسرے کو موت سے ہمکنار کرتا ہے۔ پہلے زمانے میں تلوار، خنجر، نیزے اور تیر کیساتھ اور آج کے دور میں بندوق، توپ، میزائل اور ایٹم بم کے ذریعے ایک انسان بیک وقت ہزاروں لاکھوں انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار سکتا ہے۔ اب پھر آتے ہیں بیماری کی طرف۔ بیماری جہاں اپنی آخری انتہا کے طور پر موت کا سبب بنتی ہیں اور انسان کو کم از کم اس دنیا کے دکھوں اور مصائب سے نجات دلا دیتی ہے وہاں ایسی بیماریاں بھی ہیں جو موت تک تو نہیں پہنچا تیں مگر انسان کو آئندہ زندگی کے لئے تکلیف اور معذوری کا ایک ایسا تحفہ دے جاتی ہیں جو ساری عمر انسان کے ساتھ چلتی ہیں۔

اب اس موضوع کو میں اپنی طرف موڑتا ہوں اور اپنے ''نقوش حیات'' میں اپنی بیماریوں اور تکالیف میں چند ایک کا مختصر ذکر کرتا ہوں۔ مجھے اپنی پہلی بیماری جو یاد ہے وہ نمونیہ کی بیماری ہے۔ میں چوتھی جماعت میں پڑھتا تھا کہ میں بیمار پڑ گیا۔ بخار تو ہوتا ہی تھا مگر بخار، جسم میں درد اور سینے میں تکلیف کے آثار نے میرے والدین پر میری بیماری آشکارا کر دی اور اس وقت ہی میں نے اپنے والدین اور بڑوں سے پہلی مرتبہ نمونیہ کا نام سنا۔ جسمانی طور پر میں بچپن میں کوئی زیادہ ہٹا کٹا اور صحت مند نہیں تھا ایک دبلا پتلا نارمل صحت کا لڑکا۔ مگر اس بیماری نے مجھے اور بھی کمزور کر دیا کئی دنوں تک مسلسل بخار کی کیفیت رہی۔ کبھی تیز بخار ہوتا اور کبھی طبیعت سنبھل جاتی۔ ہسپتالیں اور انگریزی دوائیاں تو دیہاتوں میں ہوتی نہیں تھیں، گھر میں دیسی ادویہ،

ٹونے ٹوٹکے، مالش،ٹکور غرضیکہ تمام طریقے آزمائے گئے مگر میری تکلیف میں کمی نہ آئی۔

میں ماں کی گود کی عمر سے نکل چکا تھا مگر ہماری والدہ مرحومہ (بے جی) مجھے گھنٹوں گود میں لیے بیٹھی رہتیں اور ہر آنے جانے والے سے میری بیماری کا ذکر ضرور کرتیں Self Medication کا رواج عام تھا لہٰذا کوئی دیسی دوائی نہ چھوڑی گئی جو مجھ پر آزمائی نہ گئی ہوں مگر

ے مرض بڑھتا گیا جوُں جوُں دوا کی

کے مصداق کوئی افاقہ نہ ہوا

میری جسمانی کمزوری بھی انتہا کو پہنچ گئی۔جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گیا اور میرے معصوم ذہن کو اپنی بیماری کی سنگینی کا احساس اس وقت ہونے لگا جب میری ''بے جی'' (والدہ) کے آنسوان کی گود میں پڑے ہوئے میرے جسم پر گرتے اور چہرے سے شدید بے بسی اور مایوسی کا اظہار ہوتا۔مگر وہ کیا کہتے ہیں کہ جب تک سانس، تب تک آس میرے بڑے برادران اس وقت قریبی قصبے میں گورنمنٹ مڈل سکول باہتر میں سبق پڑھتے تھے اور وہاں ان کا روز کا آنا جانا ہوتا تھا۔خوبیِ قسمت سے ہمارے ایک دُور کے رشتہ دار سید محبوب شاہ آف بوٹا (جواب بھی بقید حیات ہیں)، اس وقت حکمت کا کوئی کورس کر کے آئے اور موضع باہتر میں کلینک کھول لیا۔اورحسبِ روایت وہ طبِ مشرقی اورانگریزی طب کا مِلا جلا علاج کرتے تھے۔میرے والد بزرگوار نے میرے بھائیوں کے ذریعے انہیں پیغام بھیجا کہ وہ ہمارے گاؤں آکر مجھے دیکھیں اور ساتھ ضروری دوائیں بھی لیتے آئیں۔چنانچہ وہ شام کو ہمارے بھائیوں کے ہمراہ ہمارے گھر آگئے۔رات کو سٹیتھسکوپ کے ذریعے میرا معائنہ کیا نمونیہ کی تصدیق کر لینے کے بعد انہوں نے مجھے ایک انجکشن لگایا۔(غالباً یہ Combiotic یا پنسلین کا انجکشن تھا اس وقت Antibiotic ادویہ میں Combiotic) ہی جدید ترین انجیکشن تھا۔شاید میری زندگی میں پہلی مرتبہ جسم میں داخل ہوا تھا۔اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ صبح تک مجھے افاقہ محسوس ہونے لگا اور چند ہی روز میں صحت یاب ہو کر معمول کی زندگی پر آگیا۔بیماری کے دنوں میں سٹیتھسکوپ اور انجیکشن میں نے پہلی مرتبہ دیکھی۔چند دنوں تک صحت یاب ہو کر مَیں دوبارہ گلی میں کھیل اور سکول میں پڑھائی کے مشاغل میں جُت گیا۔

2۔ نا رُو

1962ء میں مَیں اپنے والد مرحوم کے ہمراہ اپنے عزیزوں سے ملنے، تاجہ زئی، خواجہ خیل (لکی مروت) گیا۔اس سے قبل چوتھی جماعت میں بھی میں اپنے بڑے بھائی سید محمد حسین شاہ کے ہمراہ چند روز کے لیے اپنے رشتہ داروں سے ملنے لکی مروت جا چکا تھا مگر 1962ء کا یہ دورہ تقریباً پورے مہینے پر محیط تھا۔دورے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ خواجہ خیل (لکی مروت) سے ہمارے ایک رشتے کے ماموں مشہور عالم دین پیر طریقت، الحاج سید محبوب شاہ حج کی سعادت حاصل کر کے واپس آ رہے تھے۔

والد صاحب مرحوم اور میں خواجہ خیل جانے سے قبل ضلع میانوالی کے ایک گاؤں (کالا باغ اور شکر درہ کے درمیان واقع) موضع تبی سر بھی گئے۔ جہاں ہماری سگی پھوپھی مقیم تھیں۔میرے لئے تبی سر کا سفر بذات خود ایک مہم جوئی (ایڈونچر) سے کم نہیں تھا۔نویں جماعت کا طالب علم اور کالا باغ سے تبی سر تک اٹھارہ میل (تقریباً تیس کلومیٹر) پیدل سفر تھا تاہم اس سفر کا ذکر کسی اور موقع پر۔

یہاں صرف ایک اور بیماری کا ذکر مقصود ہے اور وہ ہے نا رُو۔ نا رُو مقامی زبان کا لفظ ہے اور ہو سکتا ہے کہ لکی مروت کی آج کی نسل کو بہت کم لوگوں کو نارُو کا نام یاد ہو، تاہم یہ 63-1962ء کی بات ہے۔اُس دور میں لکی مروت کے بیشتر دیہات میں پینے کا پانی گھر میں بنے ہوئے تالابوں سے ہی دستیاب تھا۔تالاب کیا تھے گھر میں ایک کونے میں کچا یا حسبِ استطاعت پکا 50 یا 40 فٹ لمبا اور 30,40 فٹ چوڑا زیریں سطح کا گڑھا بنا دیا جاتا اور گھر کے کمروں اور برآمدوں کی چھتوں کا بارش کا صاف پانی نالیوں کے ذریعے ان تالابوں میں جمع کر لیا جاتا اور پھر سارا سال پینے کے لئے اور دیگر ضروریات کے لئے یہی پانی استعمال کیا جاتا اور اگلی برسات سے پہلے جب تالابوں میں پانی ختم ہو جاتا تو بڑی بڑی مشکیں اونٹوں پر لاد کر دور دراز نالوں اور دریاؤں سے پینے کا پانی لایا جاتا۔ سچ تو یہ ہے کہ لکی مروت کے دیہات کا وہ دور ایک صحرائی زندگی کے دور سے مکمل مشابہت رکھتا تھا۔اور یہی وجہ ہے کہ اس وقت کی مروت اقوام کے خصائص و خصائل علامہ اقبالؔ کے اس شعر سے مکمل مطابقت رکھتے تھے۔

کہ

ے فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی
یا بندۂ صحرائی یا مردِ کُہستانی

واقعی کیا سادہ، سچے اور نیک فطرت لوگ تھے۔ جفاکش، نڈر، بہادر، مخلص و مہمان نواز۔۔۔۔۔۔ قرونِ اولیٰ کے صحرائی مسلمانوں کی طرح۔ بات نارُو بیماری کی ہو رہی تھی۔ نارُو کے بارے میں مجھے جو سرسری معلومات حاصل ہوئیں وہ یہ تھیں کہ اس علاقے کے گھروں میں بنے ہوئے تالابوں سے پینے کے پانی سے ایک ایسا (کیڑا) معدے کے ذریعے جسم میں داخل ہو جاتا ہے جو داخل ہونے کے بعد کئی ماہ تک انسانی جسم کے اندر پلتا ہے اور جب وہ بالغ ہو جاتا ہے تو جسم کی جلد کے کسی حصے (عموماً ٹانگ) سے باہر آنے کی کوشش کرتا ہے۔ باہر آنے کی کوشش میں ابتدا میں اس جگہ ایک دانہ سا بنتا ہے جو خارش کرتا ہے مگر جب وہ کیڑا سر نکالتا ہے تو اسے ایک خاص طریقے سے آہستہ آہستہ کھینچ کر باہر نکالا جاتا ہے باہر نکالنے کی کوشش میں اگر آپ سے جلدی یا بے احتیاطی ہو گئی یعنی اگر وہ ریشہ نما کیڑا نکالتے ہوئے ٹوٹ گیا اور اس کا کوئی حصہ بھی آپ کے جسم میں رہ گیا تو وہ خود بخود زہر بن جاتا ہے اور آپ کے جسم کے اس حصے (مثلاً ٹانگ وغیرہ کو) مکمل ناکارہ بنا سکتا ہے۔ میں جماعت نہم کے ابتدائی سال لکی مروت (خواجہ خیل گاؤں) گیا تھا۔ وہاں تقریباً ایک ماہ سے زائد کا عرصہ گزارا تھا۔ اپنے ہم جولی اور کلاس فیلو (ڈاکٹر) سید جہان حسین شاہ اور دیگر ہم عمر دوستوں خصرۃ الدین، عبدالمنان، محمد اسلم وغیرہ کے ساتھ گھوما پھرا، دعوتیں اڑائیں ''پینڈے'' کھائے اور وہی تالاب کا پانی پیا بھی اور ہر جگہ استعمال کیا۔ اور واپس اپنے گھر اٹک آ گیا۔

اگلے سال دسویں کا امتحان پاس کیا اور والد بزرگوار کی خواہش کے مطابق میرے بڑے بھائی سید محمد حسین شاہ مرحوم مجھے اٹک (کیمبل پور) کالج میں داخل کروا آئے۔ کالج میں داخلے کے چار دن بعد ہی موسم گرما کی تعطیلات شروع ہو گئیں تو میں کالج سے واپس گھر آ گیا۔ گھر میں ہمارے معمولات میں اپنے باغ (ہمارے زیر کاشت زمین کو ہم باغ کے نام سے یاد کرتے تھے) میں چھوٹا موٹا کام جانوروں کے لیے چارہ وغیرہ لانا یا کاشت شدہ سبزی، پیاز، تھوم وغیرہ کو چشمے کا پانی دینا ہوتا تھا۔ لکی مروت (خواجہ خیل) سے واپس آئے ہوئے تقریباً دو سال ہو چکے تھے۔ میں باغ میں شہتوت کے بڑے درخت کے نیچے بیٹھ کر سستا رہا تھا کہ مجھے بائیں ٹانگ پر گھٹنے کے

جوڑ کے قریب خارش شروع ہوگئی۔ میں نے اس جگہ پر ناخن سے خارش کی تو وہاں ایک چھوٹا سا دانہ ابھر آیا۔ مجھے مزید میٹھی میٹھی خارش ہوتی رہی حتیٰ کہ اس دانے کو دبانے سے اس کے سر پر ایک کِل (سخت سفید چیز) نکل آئی۔ جسے میں نے کھینچا تو اس کا کچھ حصہ باہر نکل آیا۔ تجسس ختم کرنے کے لئے اور نتیجہ معلوم کرنے کے لیے میں نے اسے اپنی انگلیوں میں پکڑ کر مزید کھینچا تو وہ سفید دھاگے کی شکل میں ایک بالشت نکل کر ٹوٹ گیا۔ میں یہ نیا تجربہ دیکھ کر حیرت زدہ ہوا اور خوف اور فکر کی ایک سنسناہٹ بھی جسم میں پیدا ہوئی مگر میں اس دھاگہ نما سفید ریشے کو پھینک کر اپنا سامان سمیٹ کر چار، پانچ کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے گھر آ گیا۔ اس وقت وہاں پر میں نے اس سفید دھاگے کے بارے میں جو کچھ کیا وہ خالص لاعلمی کی صورت میں کر دیا۔

گھر پہنچ کر اپنی والدہ سے ذکر کیا تو وہ نارُو کے بارے میں اپنے علم اور مشاہدات کی بنا پر فکر مند ہوگئیں۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ مجھے بتانے لگیں کہ یہ جو آپ کی ٹانگ کے جوڑ سے سفید ریشہ نکلا ہے اسے مروت لوگ ''نارُو'' کہتے ہیں اور آپ نے اس کا کچھ حصہ نکال کر اور اسے توڑ کر سخت غلطی کی ہے یہ سن کر میں بھی پریشان ہوگیا۔ ساتھ ہی شام تک مذکورہ جگہ پر سوجن نمودار ہونے لگی اور چلنے پھرنے میں واضح تکلیف محسوس ہونے لگی۔ اتفاق سے اُسی روز خواجہ خیل گاؤں کے میرے کلاس فیلو خصرۃ الدین عرف خصر الدین اور ان کی والدہ (جو ہمارے والد صاحب کے عقیدت مندوں میں شمار ہوتے تھے) ہمارے گھر پہنچ گئے۔ خضر الدین کے بڑے بھائی (مرحوم بن یامین) ان دنوں قتل کے ایک مقدمے میں گرفتار ہو چکے تھے تو ان کی والدہ ماجدہ اپنے بیٹے کے ہمراہ والد بزرگوار سے دعا کے لیے ہمارے گھر آئی تھیں۔ وہ چونکہ اس گاؤں سے آئے تھے جہاں دو سال پہلے میں ایک ماہ گزار کر آیا تھا اور جہاں کے بیسیوں لوگ (مرد اور عورتیں) اس بیماری سے یا تو مستقل معذور ہو چکے تھے یا طویل علاج کے بعد شفا حاصل کر پائے تھے۔

مہمان خاتون نے جب نارُو کے بارے میں مزید تفصیلات بتائیں تو گھر میں والد مرحوم کی عدم موجودگی کی وجہ سے میری بے جی کی پریشانی حد سے بڑھ گئی۔ ہوا یہ کہ باغ والے واقعے کے دن ہی شام تک میرا چلنا پھرنا مشکل ہوگیا حتیٰ کہ میں اپنے کلاس فیلو خصرۃ الدین کو ملنے اپنے حجرے (بیٹھک) تک بمشکل گیا اور پھر اس وقت تک وہیں رہا جب تک مجھے فوری طور ہسپتال نہیں لے جایا گیا۔ اگلے دن میری ٹانگ میں

دانے والی جگہ سے خون بہنا شروع ہو گیا۔ میں حجرے (بیٹھک) سے گھر واپس آ گیا اور صرف بستر کا ہو کر رہ گیا۔ حالت یہ ہو گئی کہ میں جب بھی کسی ضرورت کے تحت بستر سے اٹھ کر اپنی ٹانگ پر کھڑا ہوتا تو خون کی ایک دھار دانے والی جگہ سے نکل کر میرے جوتوں کو بھر دیتی۔

میرے بڑے بھائی سید محمد حسین شاہ مرحوم (اللہ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے) گھر میں موجود تھے اور والد مرحوم کی عدم موجودگی میں والدہ مرحومہ کے بعد وہی ہمارے سرپرست اور ولی ہوتے تھے۔ انہوں نے اسی دن محلے کے چند دوستوں کو اکٹھا کر کے اگلے دن صبح سویرے منہ اندھیرے مجھے چارپائی پر اٹھا کر آٹھ دس کلومیٹر دور پیدل چل کر فتح جنگ (تحصیل ہسپتال) پہنچا دیا۔ صبح ہوئی تو ہم ہسپتال کے صحن میں تھے ہسپتال کے واحد ڈاکٹر (بنگالی ڈاکٹر) نے میرا معائنہ کر کے مجھے داخل کر لیا اور اگلے ہی دن آپریشن تھیٹر میں میرے گھٹنے کے قریب مذکورہ جگہ کا آپریشن کر کے تمام زہر آلودہ مواد نکال دیا۔ ڈاکٹر نے میرے بھائی کو بتایا کہ اگر آپ ایک دن اور لیٹ ہو جاتے تو شاید ٹانگ میں زہر اتنا زیادہ اثر کر جاتا کہ پوری ٹانگ کو کاٹنا پڑتا یا خدانخواستہ ایک ٹانگ مستقل معذور ہو جاتی۔ میں تقریباً ایک ماہ ہسپتال میں داخل رہ کر زیرِ علاج رہا۔ علاج کیا تھا؟ ایک کمپونڈر صاحب ایک سرخ رنگ کے محلول سے زخم کو دھو کر پٹی باندھ دیا کرتے تھے۔ آپریشن کی بدولت زہر آلود مواد کے اثرات سے تو میں بچ گیا مگر زخم کے طویل مدت تک مندمل نہ ہونے اور ٹانگ کے مسلسل ایک جگہ اور ایک ہی رُخ پر پڑے رہنے کی وجہ سے ٹانگ کی رگیں ایک جگہ جم کر رہ گئیں اور زخم کے بھر جانے کے بعد میری ٹانگ میں لنگڑاہٹ پیدا ہو گئی۔ جو موسم گرما کی تعطیلات کے ختم ہو جانے کے بعد کالج حاضر ہوئے ہونے کے بعد تک قائم رہی۔ میں نے کسی اور جگہ اس کا ذکر بھی کیا ہے کہ ابتدا میں کالج کے لڑکے میری ٹانگ میں معمولی لڑکھڑاہٹ کی وجہ سے اور نام یاد نہ ہونے کی وجہ سے مجھے ''وہ لنگڑا لڑکا'' کے نام سے یاد کرتے تھے۔ کالج جوائن کرنے کے بعد بھی میرا آپریشن کا زخم موجود تھا جس کے لیے میں نے مقامی فارمیسی کی دکان سے نسبتاً زیادہ پُراثر مرہم لے کر استعمال کرنا شروع کر دی جس سے میرا وہ زخم بھی چند دنوں میں بھر گیا اور ساتھ ہی چلنے پھرنے سے ٹانگ کی ''لنگڑاہٹ'' بھی چند دنوں میں ختم ہو گئی۔ نارُو ختم ہو گیا، لنگڑاہٹ بھی چند دنوں میں ختم ہو گئی مگر ''نارُو'' کی یاد اب بھی باقی ہے............ **وَإِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِين**

3۔ دل کی مستیاں

1989ء میں انٹرنیشنل فیڈریشن آف فری ٹیچرز یونین IFFTU کے ایشیائی نمائندے محترم گرنام سنگھ نے مجھے ایک خط کے ذریعے اطلاع دی کہ آپ کو آئی۔ایل۔اوILO (بین الاقوامی ادارہ محنت) کی جانب سے آسٹریلیا میں TUTA'' (ٹریڈ یونین ٹریننگ اتھارٹی) کالج میں ٹریننگ کے لیے منتخب کرلیا گیا ہے۔لہٰذا آپ وہاں پہنچنے کی تیاری کریں۔اپنے قومی پاسپورٹ کے ریکارڈ کے مطابق میں ۔۔۔۔۔۔ کو ایک طویل سفر (جس کا تفصیلی ذکر سفرنامے کے مجموعے میں کروں گا) کے بعد آسٹریلیا کے دارالحکومت سڈنی پہنچا اور وہاں سے ایک مقامی فلائیٹ کے ذریعے آسٹریلیا کے شہر Albury البری پہنچا اور وہاں سے ٹیکسی لے کر TUTA کالج والے جڑواں شہر ووڈانگا Wodonga پہنچ گیا۔



ووڈانگا Wodonga کے TUTA کالج کے ہاسٹل میں ایک فرنشڈ کمرہ رہائش کے لیے مل گیا اور ہماری ٹریننگ شروع ہوگئی۔اس تربیتی عرصے میں یعنی دسمبر اور جنوری کے مہینوں میں آسٹریلیا میں پاکستان کے برعکس گرمی کا موسم عروج پر تھا مگر کالج کی پوری عمارت (رہائشی علاقے سمیت) پانی کے پائپوں

کے نظام سے ایر کنڈیشڈ کی گئی تھی۔ اور رہائش اور خوراک کی بہترین سہولیات میسر تھیں۔ حتیٰ کہ ہمارے ہاسٹل کے کمروں کے باہر ایک مناسب فاصلے پر دودھ، چائے کافی، ڈبل روٹی اور بسکٹ کی وافر مقدار بھی رکھ دی گئی تھی۔ جہاں پر ہم اپنی خواہش اور موڈ کے مطابق کسی بھی وقت چائے یا کافی برقی ہیٹروں پر خود تیار کر کے استعمال کر سکتے تھے۔ جبکہ ناشتے اور دو وقت کا معیاری کھانا میس میں دستیاب ہوتا تھا۔

ہماری ٹریننگ کے دو گروپ تھے۔ ایک گروپ میں ایشیا، بحرالکاہل کے آٹھ دس ممالک کے اساتذہ تنظیموں کے رہنما تھے اور زیر تربیت (Trainee) سب کے سب اساتذہ تھے۔ جبکہ ہمارے گروپ میں انہی ممالک (ایشیا/ بحرالکاہل) کے اتنے ہی تعداد میں لیبر یونین کے نمائندے شامل تھے۔ اولذکر۔ گروپ کے زیر تربیت افراد WCOTP (ورلڈ کنفیڈریشن آف ٹیچنگ پروفیشن) کی تنظیم کی نمائندگی کر رہے تھے جبکہ ہمارے گروپ کے افراد براہ راست ILO کی نمائندگی کر رہے تھے۔ کالج میں وقتاً فوقتاً ہفتے دو ہفتے کے شارٹ کورسز بھی چل رہے تھے جن میں ایشیا کے علاوہ یورپ اور جاپان وغیرہ کے افراد بھی تربیت کے لیے آتے تھے۔ بات مختصر کر کے ''دل کی مستی'' کا ذکر کرتے ہیں۔

TUTA کالج کے ڈائریکٹر Mr. Drew Fill ایک طویل القامت، قوی الجثہ انسان تھے مگر بَلا کے محنتی اور مستعد۔ بعض اوقات تو وہ تین تین، چار چار گھنٹے مسلسل ہمیں پڑھاتے رہتے اور تھکنے کا نام نہیں لیتے تھے جبکہ وہ ہم سے بھی اتنا ہی کام لے کر ہماری روٹی، روزی حلال کروانے میں ہماری مدد کرتے اور نہ صرف کلاس روم میں بلکہ لائبریری اور گھر کا کام (Assignment) دے دے کر ہمیں مشغول رکھنے کی پوری کوشش کرتے۔ ایک دن میرے ہاسٹل کے کمرے میں مَیں اور میرے لاہور سے واپڈا کے ایک پاکستانی ورکر۔۔۔۔۔۔۔ شاہ صاحب اور بنگلہ دیش ڈھاکہ (مشرقی پاکستان) سے محبوب الرحمان حسب معمول ایک Assignment کر رہے تھے کہ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ شروع میں تو میں نے صبر کیا کہ شاید خود ہی ٹھیک ہو جائے مگر، بقول احمد ندیم قاسمی

دل کچھ اس زور سے دھڑکا کہ قیامت کر دی

جب دل کی دھڑکن کی آواز سچ مچ خود میرے کانوں تک پہنچنے لگی اور سینے پر میرے ہاتھ اس کو واضح

محسوس کرنے لگے تو میں نے چپکے سے اپنے (بنگلہ دیشی) ساتھی محبوب الرحمان کو باہر بلا کر اس کو اپنی پریشانی سے آگاہ کر دیا۔ (دوسرے ساتھی (پاکستانی شاہ صاحب) سے اس لیے خفیہ رکھا کہ وہ کچھ بہت ہی شریف الطبع اور کمزور دل واقع ہوئے تھے) محبوب الرحمان بڑے ہی ہمدرد اور نیک دل انسان تھے اور فوراً ہی مجھے لے کر ہاسٹل کی کیئر ٹیکر (ایک انگریز خاتون نام یاد نہیں) کے فلیٹ پر لے گئے اور وہ خاتون اپنے سن رسیدہ شوہر کے ساتھ بیٹھ کر سلائیوں پر سویٹر بن رہی تھیں۔ ہمارے بتانے پر وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئیں اور شوہر کی طرف دیکھ کر کہا کہ میں انہیں ہسپتال پہنچاتی ہوں۔ چنانچہ اس خاتون نے اپنی ذاتی گاڑی پھرتی سے نکالی اور ایرپورٹ والے قریبی (جڑواں) شہر (Albury) البری کی طرف چل پڑیں۔ راستے میں مجھے باتوں میں لگانے کے لیے اس نے مزاحیہ انداز میں پوچھا کہ "بتاؤ نہ میری ڈرائیونگ کیسی ہے" اور پھر چند منٹوں میں اس نے مجھے اور محبوب الرحمان کو البری کے سرکاری ہسپتال پہنچا دیا۔

ہسپتال کے عملے (ڈاکٹروں وغیرہ) نے مجھے ICU کمرے میں پہنچا کر میرا بلڈ پریشر وغیرہ چیک کیا اور مجھ سے مانیٹرز کے ساتھ اٹیچ کر کے ہماری کیئر ٹیکر اور محبوب الرحمان کو فارغ کر دیا اور مجھے بہت ہی احتیاط سے لیٹے رہنے، حرکت بالکل نہ کرنے بلکہ واش روم تک نہ جانے کا کہہ دیا اور ساتھ ہی بتایا کہ کل آپ کے لیے کارڈیولوجسٹ (ماہر امراض دل) کو بلائیں گے اور وہ آپ کا معائنہ کر کے کوئی مشورہ دے سکے گا۔ ڈاکٹر اور طبی عملہ تو مجھ سے فارغ ہو کر مجھے سکون کے لئے اکیلا چھوڑ گئے مگر مجھے عجیب وغریب وسوسوں اور پریشانیوں نے آگھیرا۔ دل کی بیماری کا تو دوسروں سے ہی سنا تھا کہ وہ زیادہ عرصہ دوستی اور رفاقت کی قائل نہیں ہوتیں بلکہ بیشتر واقعات میں ایک دو ہچکیوں کے بعد ساتھ چھوڑ جاتی ہیں۔

"یا اللہ اب کیا ہوگا؟" اگر خدانخواستہ کچھ ہوگیا تو سات سمندر پار۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مجھے تو اپنے ملک میں قبر بھی نصیب نہیں ہوگی۔۔۔۔۔ یا اللہ میرے School going عمر کے چھوٹے چھوٹے بچوں کا کیا بنے گا، اور اگر مجھے کچھ ہوگیا تو میری اہلیہ پر کیا بیتے گی وغیرہ وغیرہ ساری رات اسی سوچ وفکر میں غلطاں اللہ کو یاد کرتے کرتے نہ جانے کب نیند آ گئی۔ صبح آنکھ کھلی تو میری شیو کیلئے حجام میرے بستر پر ہی پہنچ گیا۔ مجھے عجیب تو لگا لیکن شیو کروالی اور اور کچھ دیر بعد کارڈیولوجسٹ آ گیا۔ اُس نے مجھ سے معمول کے (دل کے

مریضوں والے) سوالات پوچھے۔

مثلاً سموکنگ کرتے ہو؟ ڈرنک کرتے ہو؟ خاندان میں ہرٹ اٹیک کا مرض؟ وغیرہ وغیرہ مگر سب سوالوں کے جواب نفی میں سن کر ڈاکٹر بھی حیران ہو کر مجھے کہنے لگا کہ میں ایک دوائی (گولی) لکھتا ہوں وہ استعمال کرنا شروع کر دو اور اپنے ملک (پاکستان) جا کر کسی کارڈیولوجسٹ سے چیک کروا لینا۔ اور ڈاکٹر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد ICU کے دروازے میں وہی کلاس روم والا طویل القامت شخص (ہمارا ڈائرکٹر Mr. Drew Fill) کھڑا نظر آیا وہ مسکراتے ہوئے ادھر ہی کھڑے کھڑے پوچھنے لگا How are you Mustaq? میں نے بھی مسکراتے ہوئے ''Fine'' کہا تو اس نے بتایا کہ تم اب ٹھیک ہو اور ہم تمہیں واپس ہاسٹل لے جانے کا انتظام کر رہے ہیں۔ اور وہاں میری دل کی دھڑکن اس وقت تک تھم چکی تھی۔ میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ کم از کم فوری طور پر اپنے ہم ''مکتب ساتھیوں'' Training fellows سے تو جا ملوں گا۔ واپس ہاسٹل لایا گیا تو میں بالکل نارمل تھا سب ساتھی باخبر ہو گئے۔ کچھ نے تو کمرے میں آ کر میری خیریت دریافت کی اور باقی ساتھیوں سے اگلے روز کلاس میں جا کر مِلا۔ اس دن کلاس میں میرا VIP استقبال ہوا اور مجھے گلدستہ پیش کیا گیا۔ یاد رہے کہ ہسپتال کے تمام اخراجات TUTA کالج نے خود برداشت کیے تربیتی دورے سے واپس آنے کے بعد میں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے ایک دیرینہ شاگرد ڈاکٹر مسعود احمد سے رابطہ کیا۔ وہ اس وقت لیڈی ریڈنگ ہسپتال میں ایک کارڈیولوجسٹ ڈاکٹر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ کے ساتھ ہاؤس جاب کر رہا تھا۔ اگلے دن اس نے مجھے ڈاکٹر سے مِلوایا کچھ ٹیسٹ کر کے اس نے مجھے معمول کی وہی گولی لکھ دی کہ دن میں ایک گولی لیا کرو اور دل کے دورے کے وقت یہ گولی زبان کے نیچے رکھ لیا کرو۔

اب میرے ''دل کے علاج'' کا ایک طویل عرصہ دورانیہ ہو گیا اور میں عرفِ عام میں دل کا مریض مشہور ہو گیا میری Pulpitation دل کی دھڑکن جب بھی شروع ہوتی تو میں ہسپتال پہنچ جاتا مجھے یاد ہے کہ سال چھ مہینے کے بعد میں ایک دو روز کے لیے ہسپتال میں باقاعدہ داخل بھی ہوتا۔ لیڈی ریڈنگ ہسپتال اور خیبر ٹیچنگ ہسپتال (شیر پاؤ ہسپتال) میں میں نے کئی راتیں گزاریں اور پھر معمول پر ہو کر واپس گھر آ جاتا۔ کئی سال اس طرح گزرنے کے بعد عزیزم فیصل علی شاہ (بیٹے) کے فوج میں شمولیت کے بعد ہمارا علاج معالجہ بھی

سی-ایم-ایچ میں ہونے لگا۔ میری اہلیہ مرحومہ چونکہ ذیابیطس کی مریضہ تھیں تو مجھے ان کے ساتھ سی-ایم-ایچ باقاعدہ ان کے علاج کے لیے جانا پڑتا۔ اس دوران میں بھی ''دل کے مریض'' کی حیثیت سے انہی ڈاکٹر میجر صاحب کے ساتھ زیرِعلاج ہوگیا۔ یہاں بھی ایک روز ایک دلچسپ واقعہ ہوا۔ فیصل (میرا چھوٹا بیٹا اب کرنل) چھٹی پر گھر آیا ہوا تھا کہ گھر پر اپنے چمن میں ایک بھاری گملہ اٹھانے پر میرے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی میں نے چپکے سے فیصل سے کہا کہ مجھے CMH لے جاؤ مگر امی کو نہ بتاؤ کہ وہ خوامخواہ پریشان ہونگی۔ چنانچہ وہ مجھے CMH لے گیا اس عرصے میں پشاور میں ایک کارڈیولوجسٹ (کرنل ڈاکٹر) تعینات ہو چکے تھے۔

وہاں پر ایک واقف کار اسٹنٹ کے کہنے پر کہ ''مجھے سینے میں تکلیف ہے'' کرنل صاحب نے مجھے فوری طور پر بلا بھی لیا اور سرسری چیک اپ کرنے کے بعد آئی سی یو وارڈ میں داخل کر دیا۔ اس وقت تک مجھے بھی معلوم ہو چکا تھا کہ یہ کوئی Heart Attack وغیرہ نہیں ہے مگر اسٹنٹ (NCO) کے بیان کو غلط کہنے پر کیونکہ اس پر حرف آ سکتا تھا ہم نے خاموشی میں عافیت سمجھی اور چپکے سے بیڈ پر لیٹ گئے مگر اس طرح ہمارے CMH خفیہ طور پر جانے کا اپنی اہلیہ پر راز فاش ہوگیا اور شام کو مجھے دیکھنے وارڈ آئیں تو میں اور فیصل اپنے جھوٹ پر سوائے خجالت کی ہنسی کے اور کچھ نہ کہہ سکے۔ تاہم رات وارڈ میں گزار کر اگلے دن وہاں سے پرانے معالج میجر ڈاکٹر۔۔۔۔۔ کے کہنے پر فارغ کر دیے گئے۔

''دل کے مرض اور اس کے علاج'' کا سلسلہ دراز ہونے پر کسی نے مشورہ دیا کہ پشاور میں دل کے ایک اچھے ماہر ''کارڈیک فزیشن'' ڈاکٹر حفیظ اللہ سے مل لیں۔ چنانچہ اپنی اہلیہ مرحومہ کے ہمراہ ڈبگری میں ان کے پرائیویٹ کلینک پہنچ گئے۔ ڈاکٹر صاحب کے معاونین کے چیک اپ کرنے کے بعد انہوں نے خود میرا معائنہ شروع کیا تو پوچھنے لگے کہ آپ کو کیا ٹینشن ہے؟ میں نے کہا کہ کوئی ٹینشن نہیں تو ساتھ بیٹھی ہوئی میری بیگم کہنے لگیں ڈاکٹر صاحب اور تو کچھ نہیں ''مگر یہ ایک رسالہ لکھتے ہیں'' ڈاکٹر صاحب نے میری طرف دیکھا تو میں نے بتایا کہ جی میں سرکاری نوکری کے ساتھ ساتھ ایک تعلیمی ماہنامہ ''ایجوکیٹرز'' کی ادارت بھی کرتا ہوں۔ اور بتایا کہ میں خود ہی اس کا چیف ایڈیٹر، ایڈمنسٹریٹر اور خبر نگار، کالم نگار اور پروف ریڈر بھی ہوں۔ تو ڈاکٹر صاحب کے جوابی الفاظ تھے کہ ''Oh! very labourious work'' اور ساتھ ہی بتایا کہ وہ خود بھی

’’صحت کا ایک سہ ماہی رسالہ ایڈٹ کرتے ہیں‘‘ میں نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب آپ تو ایک روزنامہ میں ’’دل کی باتیں‘‘ بھی لکھتے ہیں تو وہ ہنس پڑے اور کہنے لگے کیا کریں دلوں کو مسلسل دیکھتا ہوں تو دل کی باتیں ہی لکھنی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے چند تفصیلی ٹیسٹ لکھے جو ساتھ والی لیبارٹری سے کروا کر اگلے دن جب دوبارہ گیا تو ڈاکٹر حفیظ اللہ نے کہا کہ آپ کو تو دل کی کوئی بیماری نہیں ہے آپ کے ’’والوز‘‘ (Volves) بھی صحیح کام کر رہے ہیں اور خود دل بھی ٹھیک ہے۔ تو میں نے قدرے حیرانی سے کہا کہ ڈاکٹر صاحب تو پھر کیا ہوا ہے میرے دل کو یہ کسی بھی وجہ سے زور سے دھڑکنے لگتا ہے تو انہوں نے میڈیکل کی زبان میں اس کی وجہ بتائی کہ ’’آیوڈین‘‘ کی زیادتی کی وجہ سے یہ عارضہ بن گیا ہے۔ میں دوائیاں لکھتا ہوں آپ استعمال کریں انشاء اللہ دوبارہ نہیں ہوگا۔ چنانچہ وہ دن اور آج کا دن کم از کم 20 سال سے زائد ہونے کو ہیں کہ دل کی وہ دھڑکن خود ذرا ذرا سی بات پر بے قابو ہو جایا کرتی تھی آج دل دھڑکتا ضرور ہے مگر صرف کسی کی آوازِ پا پر۔

ہم اپنے دل کی دھڑکن کو تیری آوازِ پا سمجھے

وَاِذَا مَرِضۡتُ فَهُوَ يَشۡفِيۡنِ

4۔ پتے کی پتھری

یہ 1998ء کی بات ہے، زندگی، ہنستے کھیلتے اور سکون سے گزر رہی تھی بیٹے اب جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ چکے تھے جبکہ ’’غالبؔ‘‘ خود ابھی جوان تھا اور کھانے پینے کی حد تک تو زندگی میں اکثر ’’رنگ رلیاں‘‘ شامل ہو جاتی تھیں۔ ہماری ’’رنگ رلیاں‘‘ کیا تھیں؟ اکثر اوقات (فیملی) بچوں کے ہمراہ اور کبھی دوستوں کے ساتھ نمکمنڈی وغیرہ کی زیارت ہوتی رہتی تھی۔ پشاور میں رہ کر ’’چرس‘‘ کے تو ذائقے سے بھی نا آشنائی رہی مگر نمکمنڈی میں چرسی کے ’آستانے‘ پر اکثر آنا جانا رہتا۔ کرنا خدا کا ایسا ہوا کہ ایک صحت مند جسم کے ہوتے ہوئے کبھی کبھار پیٹ میں درد کی تکلیف اٹھنے لگی۔ پیٹ میں ناف سے ذرا اوپر اچانک درد کی تکلیف شروع ہو جاتی۔ ابتدا میں تو چند ساعت کے لیے ہوتی مگر اس کا دورانیہ بڑھتے بڑھتے آدھے گھنٹے اور گھنٹے تک پہنچ جاتا۔ ساتھ ہی اس کی شدت میں بھی دن بدن اضافہ ہونے لگا۔ یار لوگوں نے شروع شروع پیٹ کے درد کی عام دوائیوں اور ٹُونے ٹوٹکوں سے کام چلانے کی کوشش کی مگر

مرض بڑھتا گیا، جوں جوں دوا کی

نوبت بہ ایں جا رسید۔ کہ اب یہ تکلیف رات کو اچانک شروع ہوجاتی اور بے بسی سے اس شدید درد کو برداشت کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ ہوتا۔ مجھے یاد ہے کہ درد جب حد سے بڑھ جاتا تو میں بستر پر ہی پیٹ پکڑ کر کھڑا ہوجاتا اور جب تک درد کی شدت کم نہ ہوتی تو میں بستر کے اوپر ہی کھڑا رہتا۔

ایک تلخ حقیقت یہ بھی ہے کہ ان دنوں بیماریوں کے کم ہونے کی وجہ سے ان کی آگاہی ''Awareness'' بھی کم تھی۔ اردگرد کے لوگوں اور احباب میں سے کبھی کسی نے نہیں بتایا کہ ان نشانیوں ''Symtoms'' کے ساتھ یہ پتے کی کوئی تکلیف ہوسکتی ہے۔ تاہم ایک روز صبح کی اذانوں کے ساتھ مجھے درد کی شدت زیادہ ہوگئی تو میں نے ثاقب (بیٹے) سے کہا کہ مجھے سی-ایم-ایچ پہنچاؤ۔ اس نے گاڑی نکالی اور ہم سی-ایم-ایچ ہسپتال ایمرجنسی میں پہنچ گئے۔ انہوں نے غالباً سب سے پہلے تو مجھے درد کے لیے کوئی انجکشن وغیرہ لگایا۔ اور پھر بھلا ہو ایمرجنسی پر موجود ڈاکٹر کا کہ اس نے میرا ایکسرے کرنے کو کہا اور جب دوپہر کو ایکسرے کا نتیجہ آیا تو پتہ چلا کہ جناب آپ کے پتے میں تو پتھری ہے اور وہ اب اتنی جوان ہوچکی ہے کہ ''علاجِ دنداں، خراجِ دنداں'' کے مصداق اُسے چیر پھاڑ کر ہی نکالنا پڑے گا۔

قہر درویش بر جان درویش، ڈاکٹر کی رائے کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا پڑا۔ خوش قسمتی سے ان دنوں میرے عزیز بھتیجے ڈاکٹر (آجکل کرنل) ارشاد حسین شاہ سی-ایم-ایچ میں ہاؤس جاب پر تھے اور اس وقت سی-ایم-ایچ پشاور کے سربراہ بریگیڈئیر امین صاحب کافی نامی گرامی سرجن تھے۔ چنانچہ بریگیڈئیر صاحب سے معائنہ کرانے کے بعد آپریشن طے ہوگیا۔ اور آپریشن سے ایک دو روز قبل مجھے آفیسر وارڈ میں ایک کمرہ بھی الاٹ ہوگیا۔ مجھے کسی نے بتایا کہ راولپنڈی کی سی-ایم-ایچ میں پتے کے آپریشن کا ایک نیا طریقہ رائج ہوچکا ہے جس میں صرف ایک ڈیڑھ انچ کا کٹ لگا کر الیکٹرانک اوزاروں کے ذریعے پتے کی پتھری کو توڑ کر باہر نکال لیا جاتا ہے مگر ہمارے آپریشن میں چھ انچ لمبا زخم ہمارے مقدر میں لکھ دیا گیا تھا اور وہی ہوا۔ تسلی بخش امر یہ تھا کہ آپریشن کے دوران میرے ہاؤس جاب ڈاکٹر بھتیجے آپریشن تھیٹر میں موجود تھے جس سے میرے دل کو یک گونہ اطمینان ضرور حاصل تھا کہ جو بھی ہوا اللہ خیر کرے گا۔ تو جناب مقررہ دن پر آپریشن تھیٹر میں

آپریشن کر کے ہمارے پِتے میں نمکمنڈی سے بننے والی پتھری نکال دی گئی۔

آپریشن تھیٹر میں جانے اور آپریشن کے تمام مراحل سے گزرنے کا یہ اولین تجربہ تھا چنانچہ انجکشن لگنے کے ساتھ ہی کلمہ پڑھ کر بے ہوش ہو جانے اور کمرے کے بستر پر جا کر ہوش میں آنے کے مرحلہ اور تجربہ سے اس جانِ ناتواں کو خود گزرنا پڑا۔ بعدازآپریشن کی تکلیف ایک طرف مگر بے ہوشی کی دوا کے مابعداثرات مجھے آج تک یاد ہیں۔ میری زندگی کا پہلا موقع تھا کہ گھر میں تیمارداری کے لیے آنے والے خواتین و حضرات سے ملنے اور ان سے بات چیت تک کرنے پر بھی مجھے ناگواری کا احساس ہوتا تھا اور یہ کیفیت کئی دن تک رہی۔ تاہم دوسری طرف بڑے زخم کے مندمل ہونے میں تقریباً ایک ماہ لگ گیا لیکن زخم ٹھیک ہو جانے کے بعد پیٹ کے درد کی وہ دائمی شدید تکلیف ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی۔

ایک دلچسپ واقع:

آپریشن کے اثرات ختم ہو جانے کے بعد معمولاتِ زندگی جب معمول پر آ گئے تو ہمارے ایک عزیز شاگرد اور دوست اشراف خان جو اپنی مہمان نوازی کے لیے مشہور تھے، نے ایک دن اچانک کہا کہ ''سر چلیں نا آج ''چرسی'' کے پاس چلتے ہیں''۔ ''اندھا کیا جانے دو آنکھیں''۔ فوراً ہاں کر دی کہ آفس کے بعد سیدھا وہاں چلے جائیں گے۔ آپ یقین کریں کہ اس موقعے پر ڈاکٹروں کی وہ تمام ہدایات ذہن سے محو ہو گئیں جو انہوں نے کچھ پرہیزی کھانوں اور خاص کر خوراک میں چربی کا استعمال پوری زندگی کے لیے ترک کر دینے کے لیے دی تھیں۔ تاہم اشراف خان کی دعوت اور وہ بھی نمکمنڈی کے چرسی کی۔ یاد رہے کہ ان دنوں میں 'چرسی' تکہ فروش کی نمکمنڈی میں صرف ایک ہی دکان تھی البتہ شہرت زیادہ ہو جانے کی وجہ سے اس نے دکان کے اوپر کچھ بالاخانے بھی آراستہ کر رکھے تھے جہاں پر معزز مہمانوں کے لیے تکے، ورینۃً اور کڑاہی گوشت (خالص چربی میں بنا ہوا) پیش کیا جاتا تھا۔ چنانچہ جناب ہم چرسی کی دکان پر کام ودِہن کی لذتوں سے خوب فیض یاب ہو کر جب گھر واپس آئے تو اچانک خیال آیا کہ مابدولت پر تو تو چربی والے گوشت کی تمام لذت عمر بھر کے لئے ممنوع ہیں اور ہم نے یہ کیا کر دیا۔۔ ۔۔۔۔مگر اب پچھتائے کیا ہوت۔۔۔۔۔۔۔۔۔جو ہونا تھا ہو چکا تھا۔

مگر اللہ کے کام اللہ ہی جانتا ہے وہ کبھی کبھی انسانوں سے ایسی حرکتیں کروا کے تماشا دیکھتا ہے اور بقول عدمؔ

ہنستا تو ہوگا آپ بھی یزداں کبھی کبھی

تو جناب ہم نے چرسی کے کڑاہی تکے بھی پیٹ بھر کر کھا لئے اور ہمارے ساتھ کوئی غیر معمولی واقع بھی نہیں ہوا اور آج تک کھانے کے معمولات وہی ہیں اگرچہ عمر کی وجہ سے کچھ ''پرہیزات''۔خود بخود آ گئے ہیں۔ یاد رہے کہ ہماری اس حرکت کو آجکل کے کرونا وبا کے بارے میں ان لوگوں کی جراءت آموزی پر معمول نہ کیا جائے جو احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کی یاددہانی پر بلا تامل کہہ دیتے ہیں کہ ''مَڑا کُم زائے دے کرونا۔ داٹول گپ شپ دے''۔(کدھر ہے کرونا۔ یہ سب گپ شپ ہے۔)

5۔ خانسپور (ایوبیہ) کا حادثہ

1967-69 میں ادارہ تعلیم و تحقیق پنجاب یونیورسٹی میں تعلیم کے دوران سب سے زیادہ جس معلم نے مجھے متاثر کیا وہ ڈاکٹر شوکت علی صدیقی تھے۔ ڈاکٹر شوکت علی صدیقی بنیادی طور پر پنجاب کے ضلع سیالکوٹ کے ایک بہت ہی غریب خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ابتداء میں وہ پاکستان ریلوے میں ایک نچلے درجے کی آسامی پر کام کرتے رہے مگر بعد ازاں اپنی تعلیمی قابلیت کو بہتر بنا کر یونیورسٹی کے پروفیسر اور بعد ازاں یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے عہدے تک پہنچے۔ زندگی میں بہت سے Selfmade انسان دیکھے مگر ڈاکٹر صاحب کی شخصیت میرے لئے واحد مثالی شخصیت رہی۔ ڈاکٹر شوکت صدیقی کی زندگی پر لکھنے کے لیے پوری کتاب درکار ہے مگر میں اس وقت موضوع کے اعتبار سے ڈاکٹر صاحب کی قائم کردہ تنظیم ''پاکستان ایجوکیشن فاؤنڈیشن'' تک ہی محدود رہنا چاہوں گا۔ ڈاکٹر صاحب یونیورسٹی کے سینئر پروفیسر اور علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہونے کی حیثیت سے ''استاد الاساتذہ'' کے لقب کے حقدار ہیں۔

1998ء میں سرکاری نوکری سے سبکدوش ہو جانے کے بعد آپ نے اپنی صلاحیتوں کو سماجی خدمات کے لئے وقف کرنے کا ارادہ کیا اور اس مقصد کے لیے اپنے پرانے رفقا اور شاگردوں سے مل کر ''پاکستان ایجوکیشن فاؤنڈیشن'' کی بنیاد رکھی۔ ''پاکستان ایجوکیشن فاؤنڈیشن'' کے بنیادی مقاصد میں تعلیم کے تدریسی اور پیشہ ورانہ پہلو پر سیمینار، کانفرنس کروانا، کتب کی اشاعت اور ماہانہ اور سہ ماہی رسائل و جرائد کی اشاعت سرفہرست تھی۔ اس کے علاوہ قابل مگر نادار زیرِ تعلیم بچوں کو وظائف مہیا کرنا اور قدرتی آفات مثلاً

زلزلے اور سیلاب کی صورت میں غریب اور نادار طلبہ کے لئے کتب، کاپیاں اور وظائف مہیا کرنا بھی فاؤنڈیشن کے مقاصد میں شامل ہے۔



ڈاکٹر شوکت علی صدیقی کا تعارف تو بحیثیت استاد کے ہی میرے لئے کافی تھا مگر ریٹائرمنٹ کے بعد ان کی سماجی سرگرمیوں سے ابتدا میں لاتعلق ہی رہا مگر اپنی سرکاری نوکری سے ریٹائرمنٹ کے بعد ڈاکٹر صاحب نے میرے ایک کلاس فیلو ڈاکٹر ابراہیم خالد کے ذریعے مجھے فاؤنڈیشن کی عملی سرگرمیوں میں شامل ہونے کا پیغام بھیجا تو میں بلا تامل فاؤنڈیشن کا فارم رکنیت پر کر کے اس میں شامل ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب کے عملی اور سماجی کام سے لگن اور تنظیمی امور میں اعلیٰ مہارت سے متاثر ہو کر میں بھی ہمہ تن تنظیم کے کاموں میں مصروف ہو گیا۔ مرکز اور دیگر صوبوں میں فاؤنڈیشن کی بہترین تنظیم موجود ہونے کے باوجود صوبہ خیبر پختونخوا میں تنظیم برائے نام تھی۔ تنظیم پر قابض ناتجربہ کار لوگوں نے اسے کھیل تماشہ بنا رکھا تھا چنانچہ ڈاکٹر صاحب اور دیگر رفقاء نے خواہش ظاہر کی کہ میں خود فاؤنڈیشن کی تنظیمی سرگرمیوں میں شامل ہو کر اسے اس کے مقاصد کے مطابق چلانے میں ان کی مدد کروں۔ چنانچہ 2008ء میں پہلی مرتبہ مجھے صوبہ سرحد (خیبر پختونخوا) کے مشاورتی بورڈ کا صوبائی کنوینر (صدر) منتخب کر لیا گیا۔

واپس آج کے موضوع کی طرف آتے ہوئے میں بتاتا چلوں کہ جولائی 2011ء میں فاؤنڈیشن نے دو سالہ کانفرنس ہمارے صوبے کے ایک نہایت ہی پر فضا مقام خانسپور ایوبیہ میں منعقد کرنے کا فیصلہ کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے پنجاب یونیورسٹی سے خانسپور کیمپس کے لئے اجازت نامہ حاصل کیا اور انجینئرنگ یونیورسٹی

پشاور کے خانسپور کیمپس کے ''گیسٹ ہاؤس'' کو شرکاء کی رہائش کے لیے استعمال کرنے کا اجازت نامہ حاصل کرنا میرے ذمے سونپ دیا۔ میں نے اپنے عزیز دوست BRAINS Institute کے ڈائریکٹر ظفر اللہ خان صاحب کی مدد سے چند دنوں کے اندر اجازت نامہ حاصل کر لیا اور مقررہ تاریخ تک ہم صوبہ خیبر پختونخوا کے ایک آٹھ رکنی وفد کے ساتھ کانفرنس میں شرکت کے لئے خانسپور پہنچ گئے۔ خانسپور میں پنجاب یونیورسٹی کے کیمپس کے کانفرنس ہال میں مختلف صوبوں سے آئے ہوئے مندوبین کا شاندار تعارفی اور افتتاحی اجلاس ہوا۔ اور پھر کانفرنس کے مختلف سیشنز (Sessions) شروع ہو گئے۔ ہم صوبہ خیبر پختونخوا کے مندوبین کو رہائش کے لئے انجینئرنگ یونیورسٹی پشاور کا گیسٹ ہاؤس الاٹ ہوا۔ خانسپور کے خوشگوار موسم میں عملی امور کے علاوہ ڈاکٹر شوکت علی صدیقی (استاد محترم) کی قدم جوئی کے علاوہ دیگر صوبوں اور مرکز سے آئے ماہر تعلیم خواتین و حضرات سے ملاقاتیں اور ان کے ساتھ راہ و رسم بڑھانے کا ایک بہت ہی نادر موقع تھا جس سے سب نے بھرپور استفادہ کیا۔ پہلی رات گیسٹ ہاؤس کے ایک کمرے میں تین چار دوستوں، خاص کر جواد احمد خان صاحب اور حاجی غلام رسول صاحب کی گپ شپ اور آپس کی نوک جھونک سے خوب محظوظ ہوئے۔ اب آپ اسے میری ضعیف الاعتقادی پر معمول کریں یا اتفاقی امر۔ پہلے روز صبح جب ہم گیسٹ ہاؤس کے کمروں سے تیار ہو کر کانفرنس ہال کی طرف جا رہے تھے تو ہر ایک اپنی طرف سے اپنا چہرہ مہرہ سنوار کر اور بہترین لباس پہن کر نکلا۔ میں سفید شلوار قمیض (میرا عمومی لباس) واسکٹ اور بلوچی چپل پہن کر نکلا۔



میرے عزیز دوست اور فاؤنڈیشن کے(Co-Convenour) عقیل رزاق صاحب نے میرے لباس اور خاص کر بلوچی چپل پر خوشگوار تبصرہ کیا۔ سچی بات ہے مجھے خود اپنے آپ کو بھی اچھا لگا، تو شاید یہی وقت تھا جسے کہتے ہیں کہ نظر لگ گئی (کیونکہ کانفرنس میں شمولیت کا میرا آخری روز ثابت ہوا)۔

آج 24 جولائی کانفرنس کا دن بڑا عملی اور بھرپور کارروائی کا دن تھا کانفرنس کے دن اور رات کو مختلف سیشنز (Sessions) ہوئے۔ رات کے کھانے کے بعد کے سیشن میں کانفرنس انتظامیہ کی طرف سے شرکاء کو مختلف گروپوں میں تقسیم کر کے مختلف موضوعات پر رپورٹس تیار کرنے کا کام تفویض ہوا۔ اس سیشن میں شرکاء کو مختلف صوبوں کے مندوبین کو ملا کر گروپ بنائے گئے۔ البتہ ایک آدھ ساتھی اپنے صوبے کا بھی تھا۔ اتفاق سے گھنٹہ ڈیڑھ کے سیشن چلنے کے بعد بجلی اچانک چلی گئی۔ کچھ گروپ تو موم بتیاں وغیرہ جلا کر کام جاری رکھے رہے مگر بیشتر نے کام مکمل کر کے سیشن کا اختتام کر دیا اور غیر رسمی گپ شپ لگانے لگے۔ میں نے اپنے گروپ سے جواد صاحب کو واپس کمرے میں چلنے کے لیے پوچھا مگر انہوں نے بعد میں آنے کا کہہ دیا اور میں اکیلا ہی کمرے کی طرف چل پڑا۔ یہاں میں بتاتا چلوں کے ہم جس گیسٹ ہاؤس میں مقیم تھے اس کو دو راستے جاتے تھے۔ ایک بڑا راستہ جو روڈ کے ذریعے جاتا تھا مگر یہ راستہ گھوم کر نیچے سے آتا تھا اور تین چار فٹ چوڑا مختصر راستہ جو مین سڑک سے گیسٹ ہاؤس کی بغلی دیوار کے ساتھ سے گزرتا تھا۔ یہ راستہ ہاسٹل کی دیوار اور ایک خالی پلاٹ کے درمیان تھا۔ خالی پلاٹ سڑک سے بالکل پیوستہ اور اونچی جگہ پر ہونے کی وجہ سے غالباً تہہ خانے کی جگہ بنانے کے لیے گہرائی میں کھدا ہوا تھا۔ چنانچہ اس پلاٹ کا فرش بغلی دیوار والے راستے سے چودہ پندرہ فٹ عمودی طور پر نیچے تھا۔ جواد صاحب اور گروپ ارکان سے رخصت لے کر واپس کمرے کی طرف آتے ہوئے بجلی نہ ہونے کی وجہ سے مکمل اندھیرا تھا۔ میں اکیلا تھا اور نزدیک ہونے کی وجہ سے اسی راستے کا انتخاب کیا اور ہاسٹل کی دیوار کے ساتھ ساتھ چل پڑا۔ میں پر اعتماد اس لیے تھا کہ کانفرنس کے آغاز سے اب تک ہم نے اسی راستے کو آنے جانے کے لیے استعمال کیا تھا، مگر اللہ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

چند گز کے اس راستے کو عبور کرنے میں دو چار قدم ہی رہتے تھے کہ مکمل اندھیرے کی وجہ سے میں راستے کی سیدھ سے بھٹک جانے اور کسی ناہموار پتھر سے پاؤں پھسل جانے کی وجہ سے عمودی ڈھلوان سے

دھڑام سے نیچے فرش پر گر پڑا۔ چند سیکنڈ کے لئے تو میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھایا رہا مگر ہوش آنے پر میں اپنی جگہ پر ایستادہ ہوگیا۔شروع میں تو میں اپنی ٹانگوں پر کھڑا ہوگیا مگر جلد ہی مجھے احساس ہوگیا کہ میری بائیں ٹانگ اوپر کولہودں تک کام نہیں کر رہی۔ چنانچہ میں ایک ٹانگ پر ہی کھڑا ہوگیا۔اندھیرا تو تھا ہی۔تہہ خانہ نما فرش پر گر کر مجھے اپنے اردگرد کچھ بھی نظر نہیں آرہا تھا مگر میری کوئی نیکی اس وقت کام آگئی۔ مجھے اپنے سامنے اپنا گرا ہوا روشن موبائل نظر آگیا جس میں گرنے کی وجہ سے خود بخود روشنی آگئی تھی، ہمت کر کے میں نے موبائل اٹھایا اور عقیل رزاق صاحب کو فون کر کے بتا دیا کہ میرے ساتھ یہ حادثہ ہوگیا ہے اور جائے حادثہ کا بھی بتا دیا۔عقیل رزاق صاحب جو دوستوں کے ہمراہ سڑک پر مٹر گشت پر تھے فوراً جائے وقوعہ پر پہنچے مگر اندھیرا ہونے اور میرے کافی نشیب میں ہونے کی وجہ سے میں ان کو نظر نہیں آرہا تھا۔ بہرحال آواز کے سہارے وہ قریب پہنچ گئے اور اندھیرے میں میرا عکس انہیں نظر آگیا۔فوری طور پر موبائل کی ٹارچ کے ذریعے انہوں نے فرش تک راستہ تلاش کیا اور کسی خطرہ کی پرواہ نہ کرتے ہوئے مجھ تک پہنچ گئے میں نے انہیں بتایا کہ میرے جسم میں مزید کھڑا ہونے کی سکت نہیں ہے اور میری ایک ٹانگ تو بالکل کام نہیں کر رہی۔ چنانچہ انہوں نے کھڑے کھڑے ہی مجھے اپنے بازوؤں میں لے لیا اور اس وقت تک مجھے اپنے بازوؤں کے سہارے کھڑا رکھا جب تک کانفرنس کے بقیہ شرکاء بھی باخبر ہو کر جائے وقوعہ تک نہیں پہنچ گئے۔کانفرنس کے دیگر شرکاء کے آجانے کی وجہ سے روشنی کا انتظام ہوا تو کچھ اور ساتھی بھی دیوار نما ڈھلوان سے چھلانگیں لگاتے ہوئے مجھ تک پہنچ گئے اور مجھے جیسے تیسے اس تہہ خانہ نما فرش سے نکال کر سڑک تک پہنچا دیا۔سڑک پر تقریباً تمام مندوبین حضرات پہنچے ہوئے تھے ڈاکٹر شوکت علی صدیقی صاحب کی میڈیکل ڈاکٹر صاحبزادی نے میرا ابتدائی طبی معائنہ کیا اور فوری طور پر ہسپتال پہنچانے کا مشورہ دیا۔

اسلام آباد Chair کے فاؤنڈیشن کے کنونیر ڈاکٹر افضل بابر صاحب کا کیری ڈبہ موجود تھا چنانچہ ڈرائیور سمیت گاڑی پہنچ گئی۔سوال اٹھا کہ مریض کو کون سے قریبی ہسپتال پہنچایا جائے۔تقریباً تمام مندوبین اس علاقے سے واقف نہیں تھے تاہم راقم کا گزشتہ کئی سالوں سے نتھیا گلی گرمائی ’’صدر مقام‘‘ ہونے کی وجہ سے واقفیت کام آگئی۔ کچھ ساتھی میرے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئے اور ہم قریب ترین نتھیا گلی ہسپتال کی طرف

چل پڑے۔نتھیا گلی کا ہسپتال شاہراہ سے کافی ہٹ کر ہے مگر راقم کی واقفیت ہونے کی وجہ سے ہم فوری طور پر نتھیا گلی ہسپتال پہنچ گئے۔ آدھی رات کا وقت تھا نتھیا گلی ہسپتال والوں نے ایکسرے اور دیگر سہولیات اور غالباً ڈاکٹر کی عدم موجودگی کا بہانہ کر کے علاج کیلئے داخل کرنے سے معذرت کر لی تاہم ایک احسان یہ کیا کہ ہمیں ایمبولنس ''ذاتی ادائیگی'' پر عنائت کر دی جس سے ہم نے ڈاکٹر افضل صاحب کا کیری ڈبہ اور دیگر ساتھیوں کو واپس بھجوا دیا اور ہم ایمبولینس میں بیٹھ کر آدھی رات کو ایبٹ آباد روانہ ہو گئے۔ ایبٹ آباد پہنچ کر میں نے سول ہسپتال جانے کی بجائے سی-ایم-ایچ جانے کو ترجیح دی۔ چنانچہ ایمبولینس ہمیں چھوڑ کر واپس چلی گئی اور مجھے آرمی میجر کا والد ہونے کی حیثیت سے سی-ایم-ایچ ایبٹ آباد والوں نے فوری طور پر داخل کر لیا اور راتوں رات ایمرجنسی میں ایکسرے غیرہ ہونے لگے۔ میں نے صبح ہونے سے پہلے ہی عزیزم فیصل علی شاہ (بیٹے) کو فون پر اپنے حادثے کی اطلاع کر دی جو سی-ایم-ایچ ایبٹ آباد میں میرا باقاعدہ علاج شروع ہونے سے پہلے ہی ایک گاڑی اور دو ڈرائیور لے کر مجھے پشاور لیجانے کیلئے صبح صبح ایبٹ آباد پہنچ گیا۔ایک گاڑی میں فیصل اور میں، سیٹ لمبی کر کے میں لیٹ گیا اور دوسرا ڈرائیور میری اپنی گاڑی کو ڈرائیو کر کے ہمارے ہمراہ چل پڑا۔ ایبٹ آباد سے ہم سیدھا سی-ایم-ایچ پشاور پہنچے اور یہاں بھی فوری طور پر تشخیص اور علاج کا عمل شروع کر دیا گیا۔ مجھے افسر وارڈ کے ایک انتہائی نگہداشت والے کمرے میں رکھا گیا۔ اس وقت سی۔ایم-ایچ (C-M-H) پشاور میں-ایم-آر-آئی اور سی-ٹی سکین کا انتظام نہیں تھا مگر ڈبگری کے کسی پرائیویٹ سنٹر سے سی-ایم-ایچ والوں نے میرا سی-ٹی سکین کرا دیا اور میرا علاج شروع ہو گیا۔حقیقت یہ ہے کہ میرے ہاتھ پاؤں اور ٹانگیں وغیرہ ٹوٹنے (فریکچرز) وغیرہ سے تو بالکل محفوظ رہیں مگر میرا باقی جسم اور خاص کر بایاں کولہا چودہ پندرہ فٹ نیچے براہ راست گرنے سے اس قدر متاثر ہوا کہ ہسپتال میں مَیں کسی سمت بھی چل نہیں سکتا تھا۔ حتیٰ کہ رفع حاجت اور صفائی کے لئے بستر پر ہی ایک آدمی کی ڈیوٹی لگا دی گئی۔اپنی جسمانی حالت اور معذوری کی کیفیت کو دیکھتے ہوئے مجھے پورا خوف تھا کہ میری بقایا زندگی شاید اسی طرح معذوریوں سے عبارت ہو گی اور میں شاید دوبارہ اپنے پاؤں پر چلنے کا خواب ہی دیکھ سکوں۔مگر اللہ کو جو منظور ہو، اللہ پر بھروسہ اور امید کا دامن میں نے کبھی نہیں چھوڑا۔سی-ایم-ایچ پشاور میں دس روز تک میں زیر علاج رہا۔ تاہم دس دن بعد ڈاکٹروں

نے مجھے گھر جانے کی اجازت اس شرط پر دیدی کے مجھے مکمل آرام کے ساتھ رکھا جائے گا اور کسی قسم کی حرکت وغیرہ کی اجازت نہیں ہوگی۔ میں سی-ایم-ایچ سے فیصل کے فلیٹ (واقع پشاور کینٹ) آ گیا مجھے یاد ہے فیصل کا فلیٹ دوسری منزل پر واقع ہونے کی وجہ سے مجھے وقوعہ کے دس روز بعد بھی کرسی پر بٹھا کر چار آدمیوں نے اٹھا کر بستر تک پہنچایا۔قریباً ایک ماہ تک فیصل کے ساتھ مکمل ریسٹ پر رہنے کے بعد میں کھونٹی کے سہارے چلنے کے قابل ہو گیا۔

سعودی عرب میں مقیم میرے بڑے بیٹے انجینئر ثاقب حسین شاہ میرے بارے میں بہت فکر مند تھے۔اُن کے پیغام آنے اور سعودی عرب آنے کی خواہش کو میں ہمیشہ یہ کہہ کر ٹال دیتا کہ اب میں پہلے سے کافی بہتر ہوں۔مگر عزیز کا صبر جب بے چینی اور بے صبری میں اور فرمائش اصرار میں بدلنے لگا تو میں نے کھونٹی پر ہونے کے باوجود اس کی بے چینی کے پیش نظر ویزا اور ٹکٹ وغیرہ بھیجنے کا کہہ دیا چنانچہ فوری ٹکٹ آنے پر میں ایئرپورٹ پہنچا جہاں سے مجھے ’’ویل چیر‘‘ کے ذریعے جہاز کی سیٹ تک پہنچا دیا گیا اسی طرح ریاض (سعودی عرب) ایئرپورٹ سے بھی مجھے جہاز سے ’’ویل چیر‘‘ کے ذریعے اتارا گیا اور باہر نکل کر گاڑی میں بیٹھ کر ہم ثاقب کے گھر واقع حیی الوادی ریاض پہنچ گئے۔ دو تین دن آرام کرنے کے بعد عزیزم ثاقب نے عمرہ ادا کرنے کے انتظامات کر لیے۔ ریاض سے مکہ پہنچ کر ہم نے عمرہ ادا کیا اور اگلے دن مدینہ منورہ روضہ رسول ﷺ کی زیارت کے لئے پہنچ گئے۔ مجھے یاد ہے ہم آدھی رات کو مسجد نبوی ﷺ پہنچے۔اس وقت مسجد میں رش کم ہونے کی وجہ سے کچھ عجیب سا سکون تھا۔ مقام صفہ، ریاض الجنہ اور مقام ممبر وغیرہ پر سکون ہی سکون تھا۔ اطراف مسجد میں مختلف مقامات پر نوافل ادا کرنے کے بعد روضہ رسول ﷺ پر حاضری دی۔ جہاں رش کم ہونے کی وجہ سے روضے کے سامنے سکون سے کھڑا ہونے، گریہ کرنے اور رحمت اللعالمین سے براہ راست سلام عاجزانہ پیش کرنے کی توفیق نصیب ہوئی۔

روضہ نبی ﷺ پر دعا مانگنے کے بعد میرے دل نے کہہ دیا کہ تمہاری دعا قبول ہو چکی ہے اسی دل نے بار بار کہا، اے عاجز اور ناکارہ انسان اس وقت تو کچھ مزید مانگتے تو وہ بھی مل جاتا۔ثاقب مجھے مدینۃ النبی ﷺ میں چھوڑ کر اپنی ڈیوٹی پر واپس چلا گیا۔ میں بھی گنبد خضریٰ کے سائے میں دو راتیں مزید گزار کر دوسرے عمرہ کی

ادائیگی کے لیے واپس مکہ آ گیا۔اور میرا قیام مکہ مغظمہ میں ثاقب لوگوں کی کمپنی کے ایک کیمپ میں رہا۔ میں رات کو کیمپ میں رہتا اور صبح کے وقت ثاقب کے دوست اور رفیق کار مجھے حرم شریف چھوڑ جاتے۔ میں سارا دن حرم میں گزارتا نمازیں اور نوافل ادا کرتا اور کھونٹی کے سہارے طواف بھی کر لیتا۔ رمضان ختم ہو چکا تھا اور نئے عازمین حج کی آمد شروع ہو چکی تھی مگر بہت کم۔ایک دن مسجد حرم میں بیٹھے ہوئے مطاف کی طرف دیکھا تو مجھے طواف کرنے والے بہت کم لوگ نظر آئے۔ میرے دل میں ایک خواہش امڈ کے آ گئی۔رش کم ہے کیوں نہ ایک طواف کر لیا جائے پھر خیال آیا کہ آپ کی دعا تو قبول ہو چکی ہے دیر کیسی؟ میں نے کھونٹی سائیڈ پر رکھی اور بغیر کھونٹی کے طواف کے لئے ہجوم میں شامل ہو گیا جیسے تیرنے کے شوق میں کوئی دریا میں کود پڑے۔

ؔ نجانے کون دعاؤں میں یاد رکھتا ہے
میں ڈوبتا ہوں سمندر اچھال دیتا ہے

میں طواف کی دعائیں پڑھتا ہوا چلنے لگا اور بغیر کھونٹی کے میں نے طواف مکمل کر لیا۔اس دن میں نے گھر جا کر کھونٹی رکھ دی اور آج تک بغیر کھونٹی کے ہوں آج میری جسمانی حالت یہ ہے کہ میں اب بھی روزانہ چار یا پانچ کلومیٹر (یک طرفہ) کی واک کرتا ہوں اور مجھے پتہ بھی نہیں ہے کہ خانسپور کے حادثے میں میری کونسی جگہ کو ضرب لگی تھی .... **وَ اِذَا مَرِضۡتُ فَهُوَ يَشۡفِينِ**

6۔ گھٹنے نہیں ٹیکے

2018ء میں کسی وجہ سے اچانک گھٹنوں میں تکلیف شروع ہوگئی۔اٹھتے بیٹھتے گھٹنوں سے ٹیسیں نکلتیں ساتھ ہی کندھے میں بھی تکلیف شروع ہوگئی۔ جسے ڈاکٹروں نے Frozen Shoulders کا نام دیا۔سی-ایم-ایچ کے Rehabilitation ڈیپارٹمنٹ گیا تو وہاں او-پی-ڈی کی ڈاکٹر صاحبہ نے باقاعدہ فزیوتھراپی تجویز کرنے کے ساتھ ساتھ ان چار ہدایات پر سختی سے عمل درآمد کرنے کا کہ دیا۔

۱۔ نماز کرسی پر بیٹھ کر پڑھیں۔
۲۔ واشروم میں انگلش کموڈ استعمال کریں۔
۳۔ گھٹنوں پر بیٹھ کر کوئی کام نہ کریں۔

۴۔ سیڑھیاں نہ چڑھیں۔

چنانچہ میں نے واپس آ کر اپنے واشروم میں پرانے دیسی کموڈ کی جگہ انگلش کموڈ لگوا لیا۔ نماز کیلئے کرسی کا استعمال شروع کر دیا ابتدا میں مسجد میں پڑی ہوئی پلاسٹک کی چند کرسیاں ''پہلے آؤ پہلے پاؤ کی بنیاد پر استعمال کرنا شروع کر دیں'' مگر بعد ازاں سعودی عرب سے بیٹے نے اس مقصد کے لیے ایک ہلکی سی کرسی بھی بھجوا دی جو میں مسجد میں نماز پڑھنے کے لیے ساتھ لے کر جاتا۔ چنانچہ Rehabilition وارڈ جا کر اپنا نام رجسٹرڈ کروایا اور باقاعدگی سے فزیوتھراپی بھی شروع کر دی۔ سمجھ نہیں آئی کہ فزیوتھراپی میرے گھٹنوں کی ہوئی یا کندھے کی، تاہم ابتداء میں روزانہ کی بنیاد پر اور بعد ازاں چند روز کے وقفے سے فزیوتھراپی کی مشق سے میرے گھٹنوں کی تکلیف جاتی رہی۔ اب میں مسجد نماز کے لیے بغیر کرسی کے جانے لگا اور گھر پر بھی بغیر کرسی کے نماز آسانی سے پڑھنے لگا۔ مسجد میں اب بھی کچھ احباب محبت اور احترام کی خاطر مجھے پلاسٹک کی پڑی ہوئی کرسی کی آفر کرتے مگر میں ان کا شکریہ ادا کر کے خود ہی بغیر کرسی نماز باجماعت کے لئے کھڑا ہو جاتا۔ میں نے علاج تو ضرور، رکیا فزیوتھراپی بھی کروائی مگر اللہ کے فضل سے گھٹنوں کے آگے گھٹنے نہیں ٹیکے۔

آج میرے گھٹنوں میں کوئی تکلیف نہیں ہے۔ اور اپنے موبائل پر Samsung Health کی ایپ کی مدد سے میں 6000 ہزار Steps روزانہ کی واک کر لیتا ہوں۔ 6000 steps کا مطلب تقریباً ساڑھے چار یا پانچ کلومیٹر۔۔۔ ماشاءاللہ۔ **وَإِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِينِ**

7۔ عمر کے سترہویں سال۔۔۔ آنکھوں کے عدسے

وقت کے ساتھ ساتھ جب موبائل کا استعمال حد سے بڑھنے لگا تو موبائل کے کثرت استعمال کے نتائج کے طور پر دیگر جسمانی اور روحانی عوارض کی طرح سب سے پہلا اثر آنکھوں پر بھی پڑنے لگا۔ اس سے قبل ستر سال تک میں اپنی آنکھوں کے قدرتی عدسوں سے ہی آسانی سے مطالعہ کر سکتا تھا اور بعد ازاں مطالعہ کے لیے اگر زیادہ وقت درکار ہوتا تو میں نزدیک والی عینک کا استعمال کر لیتا۔ مگر جیسا کہ میں نے پہلے بتایا کہ موبائل کے زیادہ (مگر ضروری) استعمال کی وجہ سے آنکھوں کی طرف سے انکار تو نہیں مگر احتجاج ضرور شروع ہو جاتا۔ اپنے بھتیجے کرنل ڈاکٹر سید ارشاد حسین شاہ Eyes Specialist سے مشورہ کیا تو انہوں نے سی-ایم-ایچ

جانے کا مشورہ دیا۔سی -ایم- ایچ پشاور میں ان کے دوست کرنل اور (اب بریگیڈیئر) سید ذوالفقار نے معائنہ کرنے کے بعد لینز Lens (مصنوعی عدسے) لگانے کا مشورہ دیا۔ لینز لگوانے کو بھی ہم عرفِ عام میں آنکھوں کے آپریشن کا نام دیتے ہیں۔ چنانچہ ہم بھی بیگم سمیت گھر کے دو تین افراد کے ساتھ بڑے اہتمام سے آئی وارڈ میں آپریشن کے لئے گئے۔شوگر اور خون کے ٹیسٹ وغیرہ تو پہلے سے ہو چکے تھے۔ چنانچہ آپریشن تھیٹر میں لے جا کر بیڈ پر لٹا دیا گیا۔اینستھیزیا Anesthesia (مقامی بے ہوشی) کی تو سمجھ نہیں پڑی کہ کیسے اور کس وقت ہوئی البتہ دوران آپریشن ایسا محسوس ہوتا رہا کہ ڈاکٹر صاحب آنکھ کو آہستہ آہستہ مل رہے ہیں۔ دونوں آنکھوں کو یکے بعد دیگرے ایک ہفتے کے وقفے سے لینز لگا دیے گئے اور اس دوران فرق یہ پڑا کے جس گاڑی کو خود ڈرائیو کر کے سی-ایم-ایچ لے گیا اسے واپس گھر آتے ہوئے کوئی اور ڈرائیو کر کے لایا۔

آنکھوں کے مصنوعی لینز لگانے کے بعد بھی معمولات میں کوئی زیادہ فرق نہیں آیا۔ پہلے بھی مطالعہ اور تحریر کرتے ہوئے چشمہ لگاتا اور اب بھی انہی اوقات میں چشمہ لگانے کی ضرورت پڑتی ہے۔تاہم لینز لگانے سے پہلے آنکھوں کا ''احتجاج'' کچھ زیادہ ہونے لگا تھا جواب نسبتاً کم ہونے لگا ہے۔ بہر حال قانونِ فطرت تو بہر حال ہے نا۔فطرت کا قانون تو اٹل ہے۔ ہر جاندار چیز کے تین ادوار بچپن، جوانی اور بڑھاپا ضرور آتے ہیں۔اور یہ قانون ہر جاندار چیز یعنی انسان، حیوان، جاندار اور نیم جاندار یعنی پودوں اور درختوں پر بھی لاگو ہوتا ہے۔

اور اس کے بعد ایک اور بڑی اور اٹل حقیقت ''موت'' ہے اس کا اطلاق بھی انسان، حیوان، جاندار، نیم جاندار (اور شاید بے جان چیزوں پر بھی) سب پر لاگو ہوتا ہے۔مگر ابھی تو ہم اللہ کے اس واضح فرمان کی بات کر رہے ہیں کہ

وَإِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِينِ (سورہ الشعراء آیت نمبر ۸۰)

(اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہی مجھے شفا دیتا ہے۔)

16 دسمبر... ہماری تاریخ کا خُون چکاں باب

آج 16 دسمبر 2014 ہے۔ ویسے تو ایک اور 16 دسمبر 1971 بھی ہماری تاریخ میں آیا ہے۔ انڈیا کے ساتھ جنگ جاری تھی۔ انڈیا نے ہم پر جنگ مسلط کر دی مگر اس میں قصور زیادہ تر ہمارے اس وقت کے چند جاہ پرست حکمرانوں (فوجی اور سول جنتا) کی اقتدار کی ہوس کا نتیجہ تھا۔ جنہوں نے مشرقی پاکستان کے چند غدار سیاستدانوں کے ساتھ ''ادھر ہم ادھر تم'' کا نعرہ لگا کر اقتدار بانٹنے اور ملک تقسیم کرنے کی سازش کی تھی۔ 1971 کے انتخابات میں دو مختلف سیاسی پارٹیاں اپنے مفادات کی پالیسیاں ترتیب دینے میں کامیاب ہو گئیں۔ مشرقی پاکستان میں شیخ مجیب الرحمٰن کی عوامی لیگ اور مغربی پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو کی پیپلز پارٹی۔ 1970 کے انتخابات کے بعد سازشوں کا ایک طویل سلسلہ چلا۔ مشرقی پاکستان میں بحران کی سی کیفیت پیدا کر دی گئی۔ اس دوران بھارتی حکمرانوں (اندرا گاندھی) کو موقع ملا اور اس نے کھلی جارحیت کا ارتکاب کیا اور پاکستان پر حملہ کر دیا۔ پاکستانی افواج نے ہر دو محاذ پر حملہ پسپا کرنے کی پوری کوشش کی دونوں محاذوں پر جنگ جاری تھی ہم ریڈیو پاکستان پر خبریں سن کر دل بہلاتے ظاہر ہے کوئی خبر بھی ایسی نشر نہ ہو سکتی تھی کہ جو کسی طرح پاکستانی عوام کی حوصلہ شکنی کرتی۔ مگر حالات و واقعات بتا رہے تھے کہ کچھ ہونے والا ہے۔ انہی خدشات کی کیفیت میں ایک منحوس دن 16 دسمبر 1971 کا تھا، کالج کے ایک طالب علم دوست نے راستے میں ملتے ہی یہ خبر سنا دی کہ ریڈیو پاکستان سے یہ خبر نشر ہوئی ہے کہ مشرقی پاکستان میں مقامی فوجی کمانڈروں کے باہمی معاہدہ کے تحت انڈیا کی فوج مشرقی پاکستان میں داخل ہو گئی ہے۔ پھر نہ جانے انہی دنوں میں کیسی کیسی دلدوز خبریں ملتی رہیں۔ ڈھاکہ میں پاکستانی فوج کے ہتھیار ڈالنے کی خبریں، نوے ہزار پاکستانی فوجیوں کے ہتھیار ڈالنے اور قید ہو کر بھارت منتقل ہونے کی خبریں۔ پاکستان میں ایک فوجی مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر (جنرل یحییٰ خان) سے ایک سول مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر (ذوالفقار علی بھٹو) کو اقتدار کی منتقلی۔ بقیہ پاکستان میں پیپلز پارٹی کی نئی حکومت کا قیام اپنے خاندان کے چند فوجی افراد کا مشرقی پاکستان میں قید ہونا اور بھارت منتقل ہونا۔ یہ سب کچھ تاریخ کا حصہ بنا کچھ محبِّ وطن لوگوں کو مشرقی پاکستان کی علیحدگی پر آنسو بہاتے دیکھا اور کچھ کو مغربی پاکستان میں اقتدار کے حصول پر خوشیاں مناتے دیکھا۔ بنگلہ دیش نامنظور کے نعرے، مشرقی پاکستان کے بہاری مسلمانوں کی حالت زار، مشرقی پاکستان اور انڈیا کے جنگی قیدیوں کے کیمپوں سے پاکستانی فوجیوں کے

فرار کی داستانیں۔ پاکستان کی جیل میں قید شیخ مجیب الرحمٰن کی مشرقی پاکستان منتقلی، سب کچھ خون کے آنسو رلاتی تھیں۔مگر وقت کبھی تھمتا نہیں ہے۔اس وقت سے مغربی پاکستان میں جواب (پاکستان) کہلاتا ہے ہم نے بنگلہ دیش کو تسلیم ہوتے دیکھا۔ بنگلہ دیش میں کیمپوں میں مقید بہاریوں کو پاکستان لاکر بسانے سے انکار کرتے سنا۔ نیشنلائزیشن، پاکستانی صوبائی حکومتوں کا بننا اور بگڑنا غرض کہ اکیلے پاکستان میں پیپلز پارٹی ذوالفقارعلی بھٹو کے کئی مثبت اور منفی تماشے دیکھے۔اور اسی دوران ہم نے مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش بنانے والی تین اہم شخصیات اندرا گاندھی وزیراعظم بھارت، شیخ مجیب الرحمٰن وزیراعظم بنگلہ دیش اور ذلفقارعلی بھٹو وزیراعظم پاکستان کو اپنے اپنے عبرتناک انجام کو پہنچتے دیکھا۔ایک کو اس کے اپنے فوجی نے گولی سے اڑا دیا۔ دوسرے کو اپنے ہی فوج کے چند افسران نے بغاوت کر کے قتل کر دیا۔اور تیسرے وزیراعظم ایک شہری کو قتل کروانے کے جرم میں ایک طویل عدالتی کارروائی کے بعد پھانسی کے تختے پر جھولتے دیکھا۔

فعتبر و یااولی ا لاابصار

وقت بڑی تیز رفتاری کے ساتھ چلتا رہا، 1971 کے 16 دسمبر کو گزرے ہوئے 43 سال بیت گئے۔ یہ 16 دسمبر 2014ء کا منحوس دن تھا میں حسب معمول اپنے سکول (الفیصل ماڈل ہائی سکول) میں روٹین کا دن گزار رہا تھا کہ کسی نے چلتے چلتے ٹی وی پر نشر ہونے والی خبر سنا دی کہ آرمی پبلک سکول پر دہشت گردوں کا حملہ ہو گیا ہے۔اور اندر اور باہر دونوں اطراف سے فائرنگ ہو رہی ہے۔

آرمی پبلک سکول پر حملہ۔۔۔۔۔۔ دہشتگردوں کی ذہینت، سفاکی اور دہشت کے واقعات تو روزانہ ہمارے اردگرد ہوتے رہتے تھے مگر آرمی پبلک سکول کا نام سن کر خوف کی ایک سنسنی پورے جسم میں دوڑ گئی۔ پاکستان آرمی۔۔۔ میرے ملک کی اندرونی و بیرونی سرحدوں کی محافظ ہے میرے لئے ہمیشہ سے ایک جذباتی نام۔۔۔مگر یہاں تو معصوم بچوں کا معاملہ ہے۔ میرے دولخت جگر بھی اسی ادارے میں زیر تعلیم ہیں، میرا پوتا اور پوتی شہاب علی شاہ اور ماہم فاطمہ بمشکل وَن اور فائیو کلاس کے سٹوڈنٹ تھے یا اللہ تو میرے بچوں سمیت سب بچوں کو اپنی حفاظت میں رکھنا۔ میں باہر جانے کے لئے بلاتوقف دروازے کی طرف بڑھا تو مجھے کچھ رفقائے کار نے بتایا کہ مال روڈ جانے والی چیک پوسٹ بند کر دی گئی ہے اور آپ ادھر سے کینٹ کی طرف نہیں جا سکتے۔موقع کی نزاکت جانتے ہوئے میں نے اپنے ایک رفیق کار امجد صاحب سے درخواست

کی کہ مجھے اپنے ساتھ موٹر سائیکل پر بٹھالیں کوئی راستہ نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ امجد صاحب کے ساتھ موٹر سائیکل پر بیٹھ کر گلی سے نکل کر میں نے انہیں دائیں ہاتھ سواتی گیٹ کی طرف چلنے کو کہا۔

وہ دائیں طرف چلے اور سواتی گیٹ سے گزر کر مین باڑہ روڈ (سٹیڈیم روڈ) پر پہنچ گئے۔ اور تھوڑا سا آگے جا کر پولیٹیکل ایجنٹ کے دفتر کے ساتھ مال روڈ کی طرف مڑے یہاں پر پھر ایک آرمی چیک پوسٹ ہے۔ میں نے چیک پوسٹ پر کھڑے فوجی کو اپنا میڈیکل ٹریٹمنٹ کارڈ دکھایا اور اس کو بتایا کہ میرے بچے آرمی پبلک سکول میں ہیں اور مجھے کینٹ میں داخل ہونے کی اجازت دی جائے۔ اللہ اس نیک بندے کا بھلا کرے اس نے ٹریفک بلاک ہونے کے باوجود ہاتھ ہلا کر بلاتوقف اندر جانے کی اجازت دے دی۔ مال روڈ سے ہوتے ہوئے ہم (امن) چوک پہنچ گئے۔ جہاں سے ایک سڑک تہکال (یونیورسٹی) کو جاتی ہے۔ اور دوسری سیدھی آئی ایس آئی کی آفیسرز کالونی کے سامنے سے گزر کر آرمی پبلک اسکول کی طرف جاتی ہے۔ امن چوک چیک پوسٹ والوں نے موٹر سائیکل پر آگے جانے سے روک دیا۔ البتہ بہت ہی منت سماجت کے بعد مجھے پیدل آگے جانے کی اجازت دے دی۔ میں نے امجد صاحب کو موٹر سائیکل سمیت واپس کر دیا اور خود پیدل چل پڑا۔ امن چوک سے آئی ایس آئی کی کالونی چند قدم پر ہے۔ مگر یہ فاصلہ طے کرنے میں جیسے صدیاں لگ رہی ہوں۔ واضح رہے کہ برخوردار فیصل علی شاہ آئی ایس آئی میں پانچ سال گزار کر آج کل کوئٹہ میں سٹاف کالج کورس کر رہا تھا۔ اور اس کے بچے آنے والے سالانہ امتحان کے انتظار میں تھے کہ امتحان کے بعد یہاں سے سرٹیفکیٹ لے کر کوئٹہ چلے جائیں گے۔ میں فیصل کے فلیٹ پہنچنے سے پہلے فیصل کے دفتر کے ایک کولیگ میجر حَسن کو فون کر کے اپنے بچوں کا حال احوال پوچھ چکا تھا۔ سکول کی طرف قطعی طور پر نہ آنے کا کہہ کر اس نے پہلے فون پر بتایا کہ ہمارے بچے بخیریت ہیں۔ اور ان کو ہم تھوڑی دیر میں گھر پہنچانے کا انتظام کر رہے ہیں۔ میری قدرے تسلی ہوئی۔ مگر جب تک بچوں کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لوں کیسے تسلی ہوسکتی ہے۔ نیچے پارک میں بچوں کو نہ پا کر میں سیدھا اوپر فلیٹ پر پہنچا فہمہ بیٹی (میری بہو) نے دروازہ کھولا۔ تو اس کی ہوائیاں اڑی ہوئی نظر آئیں۔ تاہم مجھے دیکھ کر اس کی تسلی میں کچھ اضافہ ہوا ہوگا۔ اور یہی کیفیت میری تھی۔ فہمہ نے بتایا آرمی پبلک سکول جانے والے تقریباً تمام بچوں کی مائیں ہمارے گھر میں موجود ہیں۔

تاہم اس نے میرے سائڈ والے بیڈروم کا دروازہ کھول دیا اور میں بیڈروم میں بیٹھ گیا۔ ٹی وی کے تمام چینلز جیسے مار دھاڑ سے بھرپور فلمیں دکھا رہے تھے۔ اور ایک ٹی وی پر کیا موقوف۔ آرمی پبلک سکول ایک

فرلانگ دوری پر ہونے کی وجہ سے میں اپنی کالونی سے دھماکوں اور فائرنگ کی آوازیں سن رہا تھا۔ ہر دھماکے کی آواز پر یااللہ خیر کی صدائیں بلند ہوتیں اور پھر کان اگلی آواز پر لگ جاتے۔ اسی دوران میں میجر حسن کو بار بار فون کر رہا تھا۔ اور اس کا یہی جواب ہوتا کہ آپ کے بچوں سمیت چند اور بچے بھی خیریت سے ہیں۔ اور عنقریب گھر پہنچ جائیں گے۔ مگر مجھے قرار کہاں آتا تھا۔ میں نے جب چند ساعت بعد چوتھی مرتبہ فون کیا تو میجر حسن نے مجھے جواب دیا۔ کہ ''انکل آپ بار بار فون نہ کریں۔ آپ کو حالات کی سنگینی کا احساس نہیں ہے۔ البتہ آپ کو بتا چکا ہوں کہ آپ کے بچے خیریت سے ہیں''۔ اس کے جواب پر میں اسے دوبارہ فون کرنے کی جراءت نہ کر سکا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ان پر کیا بیت رہی ہے۔ تاہم دل پر جبر کر لیا۔ اور ٹی وی کو چھوڑ کر دوبارہ نیچے چمن میں آ گیا۔ اور گیٹ کے سامنے بچوں کا انتظار کرنے لگا۔ باہر چمن میں بچوں کے والدین سمیت کوئی مرد نظر نہیں آتا تھا۔ جس سے اس سنگین صورت حال کا اندازہ ہوتا جو سکول کے احاطے کے اندر بچوں اور سٹاف پر گزر رہی تھی۔ بچوں کے لئے کالونی کے مین گیٹ پر میرا انتظار۔ (اَلاِنتظَارُ اَشَدُّ مِنَ الموت) کے مصداق گھمبیر ہو رہا تھا۔ اور پریشانی صبر کی حدود کو کراس کر رہی تھی۔ کہ اچانک سب سے پہلے میرا پوتا (شہاب علی شاہ) گیٹ کے اندر داخل ہوا۔ اور مجھے چمن میں انتظار میں پا کر بجلی کی سی تیزی کے ساتھ میرے گلے لگ گیا۔ اس کے پیچھے ماہم فاطمہ (میری پوتی) تھی دور سے آتی ہوئی میری دوسرے بازو میں جھول گئی۔ سکول کے سبز کوٹوں میں ملبوس 15 / 20 بچے جب ایک ساتھ اپنی کالونی کے اندر داخل ہوئے تو سبز پوش نونہالوں کی جیسے بہار آ گئی۔ اور یہ تمام بچے چمن میں اکیلا مجھے دیکھ کر اپنے گھروں کو بھاگنے کی بجائے میرے اردگرد جمع ہو گئے۔ میں نے کوشش کی فرداً فرداً سارے بچوں کو بوسہ دے کر ان کی ڈھارس بندھاؤں۔ اور پھر اپنے بچوں کو اوپر ماں کے پاس لے آیا اور اسی بے قراری اور خوف کی کیفیت میں وہ اپنی ماں کے گلے لگ گئے۔ اور میں دوبارہ ٹی وی پر تازہ ترین دیکھنے لگا۔

اپنے بچوں کی خیریت پا لینے کے بعد ٹی وی پر سکول کی صورتحال کے بارے میں بات ہونے سے میں اپنے بچوں کو بیڈ سائیڈ پر لٹا کر خود بھی مطمئن ہو کر لیٹ گیا۔ مگر اطمینان کی یہ کیفیت زیادہ دیر تک برقرار نہ رہی۔ ٹی وی پر سکول کے اندر کی سنگین صورتحال اب بڑھ کر قیامت خیز شکل اختیار کر چکی تھی۔ معصوم بچوں اور سکول کے اساتذہ کو چن چن کر قتل کرنے کی خبریں باہر نکل رہی تھیں۔ ایمبولینسوں کی بھاگ دوڑ اور سائرن کی

آوازیں کسی بڑے قتل عام کی خبریں دے رہی تھیں۔



محمد اظہر نصیر شہید

دہشت اور خوف کے سائے پورے پشاور کو اپنی لپیٹ میں لے چکے تھے۔ پشاور سے باہر پورے پاکستان سے دوستوں اور بہی خواہوں کے فون آرہے تھے۔ وہ ہماری خیریت کا پوچھ رہے تھے۔ مگر ہنستا بستا کھیلتا پشاور اب لہو کے دریا میں ڈوب چکا تھا۔ میں ابھی فیصل کے گھر میں اپنے بچوں کے ساتھ بیٹھا ہوا خبریں سن رہا تھا کہ میرے ایک رفیق کار (محمد نصیر صاحب جو میرے ساتھ سکول میں کام کرتے ہیں) کا فون آیا اور ان کے فون نے رہی سہی کسر نکال دی۔ انھوں نے ہچکیاں لیتے ہوئے بتایا کہ محمد اظہر کی لاش مل گئی ہے۔ میں یہ خبر سن کر ہکا بکا رہ گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ نصیر صاحب کا ایک بیٹا آرمی پبلک میں سکول میں پڑھ رہا ہے۔ مگر اپنے بچوں سے اطمینان پا کر میں ایسا غافل ہوا کہ ان کے بچوں کا پوچھ بھی نہ سکا۔ آف میرے اللہ محمد اظہر تو آرمی پبلک سکول کی دسویں کے چند قابل ترین بچوں میں سے تھا۔ میں تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ آج اس کی میت دیکھوں گا۔ نصیر صاحب کا فون ملتے ہیں میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ تاہم میں سہمے ہوئے بچوں کو اسی طرح چھوڑ کر کالونی سے باہر آ گیا۔ رکشہ ٹیکسی گاڑی کا تو نام تک نہیں۔ باہر روڈ سنسان ہے۔ تاہم امن چوک تک پیدل چل کر آیا۔ سامنے چیک پوسٹ والوں نے آمدرفت اسی طرح روکی ہوئی ہے۔ میں سیدھا نصیر صاحب کے گھر پہنچنا چاہتا تھا۔ چوک کی دوسری طرف لوگ کھڑے تھے۔ سامنے دیکھا تو میرے گھر والے نظر آئے۔ انہیں بھی روکا گیا تھا۔ پتہ چلا کہ میری گاڑی میں عثمان کے ساتھ یہاں تک آگئے۔ وہ بھی بچوں کو دیکھنا ملنا چاہتے تھے۔ میں نے انہیں نصیر صاحب کے ساتھ ہونے والے حادثے کے بارے میں بتایا۔ طے یہ ہوا کہ سیدھا نصیر صاحب کے گھر جاتے ہیں۔ چنانچہ اسی گاڑی میں نصیر صاحب کے گھر پہنچ گئے۔ محمد اظہر قریشی شہید کی نعش وسط صحن میں پڑی تھی۔ ہمارے سکول کا تمام سٹاف پہنچ چکا تھا۔ شہر میں رہائش پذیران کے رشتہ دار گاؤں کے لوگ بھی پہنچ چکے تھے۔ ان کا گھر ماتم کدہ بنا ہوا تھا۔ ایک شام غریباں کا ماحول گھر کے اندر سے چیخوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ اور باہر صحن میں سناٹا تھا۔ 16 دسمبر کے سورج کو لواحقین کی سسکیوں، آہوں اور چیخوں کو سننے اور دیکھنے کی تاب نہیں تھی۔ چند لوگوں نے مل کر شہید محمد

اظہر قریشی کی میت کوغسل دیا۔ اسکے چہرے، سینے اور جسم پر گولیوں کے نشان۔ اسلام کے ہی نام پر معصوم مسلمانوں کوشہید کرنے والوں کی سفا کی گواہی دے رہے تھے۔ نام نہاد مسلمانوں کا بے گناہ مسلمانوں کوقتل کرنا، چاہے وہ اقتدار کے نام پر ہو یا نفاذ اسلام کے نام پر، جارحیت اوراور یزیدیت پہلی صدی ہجری میں ہی اپنے عروج پر تھی۔ اسلام کے نام پر حاصل کی گئی اس مملکت خداداد میں بھی کچھ اپنوں کی غلطیوں (مقاصد سے انحراف، دولت کی حرص اور اقتدار سے چمٹنے رہنے کی خواہش) اور کچھ غیروں کی سازشوں نے یہ صورتحال پیدا کردی تھی۔

معصوم اظہر شہید پر سفا کی اور دوسری طرف اس کے والد کا صبر۔۔۔۔۔۔۔اپنے بیٹے کی نعش کو ڈھونڈنے کیلئے کیسے کیسے دھکے کھائے۔ اکیلا باپ اور لاشوں کے اندر بیٹے کی لاش کی تلاش۔۔۔

انہی کا کام ہے جن کے حوصلے ہیں زیاد

ہم نے شہید محمد اظہر کو آخری غسل دے کر اس کو کفن پہنایا۔ سفید براق کفن میں۔ اس کے چہرے پر شہید کا تبسم نمایاں تھا۔

چوں مرگ آید تبسم بَر لبِ اُوست

اس گلاب کی مانند۔۔۔ جو کھلا ضرور مگر کھلِ کے مسکرا نہ سکا۔ محمد نصیر کے جواں سال معصوم بیٹے کو گاؤں ایبٹ آباد روانہ کرنے کے لئے اس کی میت کو ایمبولینس کے حوالے کر کے ہم ساتھ کی گلی میں ایف جی کی ایک استانی کے بیٹے کی تعزیت کے لیے جو کہ اس سانحہ میں شہید ہوا تھا کے لیے باہر نکلے تو رات گہری ہو چکی تھی۔

17 دسمبر 2014ء:

صبح سویرے ہی حاجی عارف یوسف ایم۔ پی۔ اے کا بلاوا آ گیا۔ پشاور کی فضاء سوگوار ہے۔ معمولی معمولی بات پر جلسے جلوس کر کے ہلا گُلا کرنے والے پشاوریوں پر آج (محارۃً نہیں بلکہ حقیقتاً) موت کی سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ہر گلی اور محلے میں ایک شہید بچے کے لواحقین کی چیخیں، تعزیتی ہجوم، دعائے مغفرت، ہر چہرہ سوگوار جنازوں کے پیغامات۔ پشاور صدر اور ملحقہ علاقہ جات کا تو ہر گھر ماتم کدہ بنا ہوا۔ کچھ مسافر تو اپنے بچوں کی نعش اٹھا کر اپنے گاؤں اور شہروں کو سدھار چکے تھے۔ اور باقی اسی شہر کی گلیوں کوچوں اور بازاروں میں تعزیتی مجلسیں سجائے نڈھال بیٹھے تھے۔ لوگ جان پہچان سے قطع نظر آتے اور مجلس میں بیٹھ کر

دعائے مغفرت کر کے اٹھ جاتے۔ ہماری گلی میں، اپنے ماموں اور نانی کے ساتھ رہائشی ایک گول مٹول موہنی شکل والا بچہ معظم علی تو صبح سکول گیا اور واپس نہیں آیا اس کے والد بیرون ملک (دبئی) میں تھے۔ اور ماموں سکول سے ہی اس کی نعش اپنے گاؤں لیجا چکے تھے۔ صبح صدر روڈ کی امام بارگاہ کالونی سے دعائے مغفرت میں شمولیت سے آغاز کیا۔ گلبرگ میں تین گھروں میں دعا میں شمولیت کی۔ گلبرگ پھاٹک میں پٹڑیوں کے قریب والی مسجد میں تین بچوں کی اجتماعی نماز جنازہ ادا کی۔



شہید پرنسپل طاہرہ قاضی

حاجی عارف یوسف ایم۔ پی۔ اے کے ہمراہ لنڈی ارباب میں ان بچوں کی حفاظت کے لیے بے ساختہ گولیوں کے سامنے آنے والی ''ماں'' اے۔ پی۔ ایس کی پرنسپل طاہرہ قاضی کے گھر گئے، ان کے لواحقین سے تعزیت کی اور ان کی قبر پر حاضری دی اور یہ سلسلہ کئی دنوں تک جاری رہا۔ 16 دسمبر 2014ء کا یہ خونچکاں واقعہ نہ صرف پشاور بلکہ پورے ملک کی تاریخ کا ایک اہم واقع ثابت ہوا۔

ظلم پھر ظلم ہے بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے
خون پھر خون ہے، ٹپکے گا تو جم جائے گا (ساحرلدھیانوی)

پاکستان کے آرمی چیف جنرل راحیل شریف اُس دن آرمی سٹاف کالج کوئٹہ میں کسی تقریب میں مہمان خصوصی تھے۔ انہوں نے یہ خبر وہیں پر سُنی اور ہوائی جہاز کے ذریعے سیدھا پشاور پہنچے۔ حالات کا جائزہ لے کر سول اور ملٹری قیادت نے ایک ''نیشنل ایکشن پلان'' ترتیب دیا۔ پاکستان آرمی نے دہشت گردوں کی مکمل بیخ کنی کیلئے ''ضربِ عضب'' کے نام سے تحریک طالبان پاکستان TTP کے درندوں کے خلاف ایک زبردست آپریشن شروع کردیا۔ ہمارے فوجی جوانوں نے اپنی جانوں پر کھیل کر جنگلوں، پہاڑوں اور صحراؤں میں ان وحشی درندوں کا پیچھا کیا اور چند ماہ کی جدوجہد اور قربانیوں کے بعد دہشت گردی کے اڈوں اور ان کے تربیتی کیمپوں کا صفایا کردیا۔ آرمی پبلک سکول کے بچوں کی شہادت ایک Game Changer واقع ثابت ہوا۔ دہشت گردی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا گیا اور نتیجے کے طور ملک میں امن وامان قائم ہوا۔

سید مشتاق حسین بخاری



مصنف کے بارے میں

نقوش حیات کے راوی خود سادہ مزاج اور خوشگوار شخصیت کے مالک ہیں۔ سو ویسا ہی سادہ اور خوشگوار اس کتاب کا اسلوب بھی ہے۔ جیسے دھیمے سروں سے بنی کوئی سمفنی (Symphony) ہو جو قاری کو خواب نگر کی سیر کروا دے۔ زندگی کے مختلف پڑاؤ سر کرنے کے بعد لکھی گئی یہ خودنوشت اس لیے بھی پُر اثر ٹھہرتی ہے کہ جن زمانوں کا نقوش حیات میں مذکور ہے اب وہ رہتل باقی بچی بھی نہیں۔ یوں مجھ جیسے ناسٹیلجیا کے مارے لوگوں کے لیے نقوش حیات کا بیانیہ اور بھی دلچسپ ہو جاتا ہے کہ ماضی کی اسی زندگی کو مکمل جزئیات کے ساتھ دیکھ چکے ہیں۔ اور جس نسل نے وہ رہتل اور وہ زندگی نہیں دیکھی ان کے لیے تو یہ بیانیہ کسی فیری ٹیل سے کم نہ ہوگا۔ وہ زندگی کہ جو ادب اور احترام، رکھ رکھاؤ اور تہذیب و ثقافت کا آئینہ تھی۔ وسائل کی کمی کا کوئی گلہ نہ تھا مگر زندگی اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ رواں دواں رہتی تھی۔ خودنوشت رقم کرنا یوں بھی ایک مشکل کام ہے۔ یادداشتوں پر مبنی یہ مواد سچائی پر مبنی نہ ہو تو بات نہیں بنتی اور سچائی کا دامن پکڑو تو بہت پردہ نشینوں کے نام آ جاتے ہیں۔ گویا کہ ''ایک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے'' والی صورتحال سے گزرنا پڑتا ہے۔ نقوشِ حیات میں سید مشتاق حسین شاہ بخاری صاحب اس کٹھن رستے کو بہ سہولت عبور کر گئے ہیں۔ اس کی وجہ ان کی فطری شرافت اور ان کا دوستانہ رویہ ہے کہ جو خود انھیں دوسروں کے لیے قابل قبول بنا دیتا ہے ساتھ ہی مشکل راستوں کا سفر ان کے لیے آسان بنا دیتا ہے۔ مصنف نے اپنی اس خودنوشت میں اپنی تمام تر یادداشتوں کو یکجا کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ جن جن مظاہر نے انھیں متاثر کیا ہے ان مظاہر کو مکمل جزئیات کے ساتھ صفحہ قرطاس پر اُتار دیا ہے۔ جن جن شخصیات نے انھیں متاثر کیا ہے ان کا حال پورے صدق دل کے ساتھ بیان کر دیا۔ خودنوشت بجائے خود ایک عجیب صنف ادب ہے۔ بظاہر راوی زندگی میں پیش آنے والے واقعات کو قلم بند کر رہا ہوتا ہے لیکن بیانیے کی زیریں سطح پر غیر محسوس طور پر خود اپنا تعارف بھی کرواتا جاتا ہے۔ اس خودنوشت ''نقوشِ حیات'' سے ہمیں اس کے راوی سید مشتاق حسین شاہ بخاری سے جو ملاقات ہوئی وہ بڑی شاندار رہی۔ یہ ملاقات ایک تہذیبی شخصیت سے ملاقات تھی۔ ایک دور افتادہ گاؤں کی ایک معصوم بچے سے ایک ماہر تعلیم ہونے تک کا سفر ہم نے نقوشِ حیات کے ذریعے لمحہ بہ لمحہ چشمِ تصور میں دیکھ لیا۔ اُستاد محترم سید مشتاق حسین شاہ بخاری کو تلمذ کے زمانے سے محبت تھی لیکن نقوشِ حیات نے اس محبت میں ایک اور تفاخر کا احساس بھر دیا ہے کہ خاکسار ایک بہت بڑی اور تہذیبی شخصیت کا شاگرد ہونے کا اعزاز رکھتا ہے۔

خالد سہیل ملک

پشاور 11 مارچ 2022